الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان
ماہنامہ
اشرفیہ
مبارکپور
فروری 2010
مبارک حسین مصباحی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبدالعزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور

زیرِ سرپرستی:
عزیزِ ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبدالحفیظ صاحب قبلہ
سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

جلد نمبر ۳۴ شمارہ ۲

فروری ۲۰۱۰ء

صفر ۱۴۳۱ھ

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ	THE ASHRAFIA MONTHLY	
دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور اعظم گڑھ یو۔پی۔ ۲۷۶۴۰۴	Mubarakpur. Azamgarh (U.P.) India. 276404	قیمت عام شمارہ: 15 روپے سالانہ: 150 روپے
چیک اور ڈرافٹ بنام **مدرسہ اشرفیہ** بنوائیں	کوڈ نمبر ——— 05462 دفتر ماہنامہ اشرفیہ ——— 250149 الجامعۃ الاشرفیہ ——— 250092 دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122	سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ 500 روپے دیگر بیرونی ممالک 20 $ امریکی ڈالر 15 £ پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: info@aljamiatulashrafia.org

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

ملت کے نام حضرت عزیز ملت کا پیغام

حضرات گرامی.......................السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ آج اسلام وسنیت کو مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے اور ہر محاذ پر مقابلہ کے لیے ماہر و معتبر علما کی جماعت ضروری ہے اور ایسے ماہرین پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی شعبوں کو مزید آگے بڑھائیں اور فضیلت سے فارغ ہونے والے علما کے لیے تحقیق اور مطالعہ کے کچھ ایسے تربیتی شعبے قائم کریں جن میں اسلام وسنیت کے ساتھ دیگر مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت، قادیانیت، رافضیت وغیرہ پر گہری نظر رکھنے والے الگ الگ گروپ تیار ہوں، جو تقریری و تحریری طور سے باطل کا جواب دے سکیں اور ان میں بھی الگ الگ ممالک اور مختلف زبانوں کے لحاظ سے افراد تیار ہوں، جو بیرون ملک بھی اسلام وسنیت کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں، اسی طرح پیدا شدہ حالات کی روشنی میں نئے نئے فقہی سوالات بھی جنم لے رہے ہیں، جن کے حل کے لیے ماہر فقہا و مفتیان کی تخریج ضروری ہے، جب کہ ابتدائی فارسی و عربی سے عالم و فاضل تک کے کورس کو مزید مستحکم و نتیجہ خیز بنانے اور زیادہ سے زیادہ اچھے افراد پیدا کرنے کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔ نصاب کی اصلاح اور نئی کتابوں کی تیاری کے لیے بھی تجربہ کار اہلِ قلم کا ایک بورڈ ضروری ہے۔ ادارے کو اسلامی یونیورسٹی کی شکل دینے کے لیے کالج کی سطح کے مختلف شعبوں کا قیام اور ان کا معقول انتظام بھی ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے مختلف اسباب و وسائل کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ سرمایہ کی فراہمی کا بھی ہے، کیوں کہ ہماری سرپرستی کے لیے کوئی حکومت نہیں ہے جو دینی منصوبوں کی روشنی میں مصارف کا انتظام کرے۔ ہماری ضروریات غریب مسلمانوں اور قوم کے اہلِ خیر حضرات ہی سے پوری ہوتی ہے۔ ادارہ کے پھیلاؤ اور تعلیمی و تعمیری ترقیاتی منصوبوں کے پیش نظر اہلِ خیر حضرات کی مزید توجہ اور اعانت کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے لیے بعض اہلِ خیر نے یہ تجویز رکھی ہے کہ پورے ملک سے دس ہزار ایسے ممبر بنائے جائیں جو کم از کم ایک بار گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے کا تعاون پیش کریں اور ادارہ ان کو اعزازی رکنیت کی سند بھی عطا کرے۔ اگر اس مطلوبہ تعداد میں ممبر سازی مکمل ہو جاتی ہے تو اگلے بہت سے منصوبوں کی تکمیل آسان ہو جائے گی۔

اس تجویز کی روشنی میں ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ دین کے فروغ و استحکام اور قوم مسلم کی سربلندی کے لیے آپ خود بھی مخلصانہ قدم بڑھائیں اور اپنے احباب و متعلقین کو بھی تیار کریں اور ایسے حضرات کی نشان دہی فرمائیں جن کو اس کارِ خیر میں شریک کیا جا سکے۔ امید ہے کہ آپ رکنیت فارم پُر کرنے کے ساتھ اپنی رقم گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے (Rs. 11,111) دستی یا الجامعۃ الاشرفیہ (Al-Jamiatul, Ashrafia) کے نام ڈرافٹ بنوا کر بہت جلد ارسال فرمائیں گے اور دوسرے ایسے اہل سنت کے پتے بھی فراہم کریں گے جن سے رابطہ کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دارین کی سعادتوں سے نوازے اور دینی کاموں میں حصہ لینے کی پوری توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی مصیبت و پریشانی سے محفوظ و مامون رکھے، آمین۔

رابطے کا پتہ: مجلسِ تعمیر و ترقی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ۔ (یو.پی.)

از: عبد الحفیظ عفی عنہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

نقوشِ قلم

مسلم ریزرویشن
حالات کا جبری تقاضا

مبارک حسین مصباحی

ہماری ملی قیادت ہو یا مسلم سیاسی لیڈر شپ، مجموعی طور پر دونوں ناکام ہیں اور یہ ناکامی امتِ مسلمہ کے مسائل حل کرنے اور غریب مسلمانوں کو ان کا حق دلانے کے حوالے سے ہے، ورنہ بجائے خود ملی قائدین ہوں یا مسلم سیاسی لیڈران اپنے ذاتی مقصد میں صدفی صد کامیاب ہیں۔ آزادی کے بعد سے آج تک مسلم قیادت نے مسلمانوں کو صرف جذباتی مسائل میں الجھائے رکھا۔ بابری مسجد کا مسئلہ ہو یا مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ۔ ان تمام مسائل میں مسلم قائدین سر سے کفن باندھ کر سرگرم رہے اور جب انھوں نے اقتدار یا دولت کی شکل میں اپنا نشانہ پالیا تو چپی سادھ کر بیٹھ گئے۔ اس سچی بات سے آج کوئی بھی صاحب بصیرت انکار نہیں کرے گا کہ اگر ملت مرحومہ کے چرب زبان مسلم لیڈران نے بابری مسجد اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے نام پر ملک بھر میں شعلہ بیانی نہ کی ہوتی تو ہندو قوم دشمنوں کی طرح یلغار نہیں کرتی۔ حالات سامنے ہیں کہ نہ بابری مسجد بچ سکی اور نہ مسلم پرسنل لا کا تحفظ ہو سکا۔ مگر ان دونوں مسائل کی عوامی جذباتیت سے مسلم قیادت نہال ہو گئی۔ اب دیکھیے جمعیۃ علماے ہند نے وندے ماترم کے مسئلہ کو بھی گرمانے کی کوشش شروع کی ہے۔ اگر انھوں نے اس کی مخالفت میں دو چار کانفرنسیں اور کر دیں تو وندے ماترم کی ننگی تلوار مدارس کی گردن تک بھی پہنچ جائے گی۔

مسلمانوں کو جذباتیت سے نہیں سنجیدگی اور دور اندیشی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی فکر، عمل کے بجائے ردِ عمل کی بن گئی ہے۔ وہ تمام مسائل صرف احتجاجی مظاہروں سے حل کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ جمہوری ملک میں کسی بھی مسئلہ کے حل کے لیے پہلے قانونی اور سیاسی راہ ہموار کی جاتی ہے اور پھر عوامی دباؤ بنا کر مسائل حل کرائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ملک کی کل آبادی میں ان کا تناسب ۱۳.۴۳/ فیصد ہے جب کہ عیسائی ۲.۳۴/ فیصد، سکھ ۱.۸۷/ بودھ ۰.۷۷/ اور جین ۰.۶۱/ ہیں۔ یہ غیر مسلم اقلیتیں اپنے اپنے دائرے میں بڑی حد تک متحد ہیں اور ہر فرقے کی قیادت اپنے مجموعی مفاد کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ اسی لیے کم تعداد کے باوجود ان کا سیاسی دباؤ حکومتوں پر مسلمانوں سے زیادہ رہتا ہے۔ ۱۹۸۴ء کے فسادات سے متاثر سکھوں نے بڑی خاموشی سے ۷۴۴/ کروڑ کا پیکیج اور دوسری مراعات حاصل کر لیں۔ مگر مسلم قیادت متعدد بھیانک فسادات سے متاثر مسلمانوں کے لیے کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ بلکہ فساد زدہ مسلمانوں کو خطرناک مقدمات میں الجھا کر آج تک نشانۂ ستم بنایا جا رہا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی زبوں حالی اب نوشتۂ دیوار ہو چکی ہے۔ بڑی شد و مد کے ساتھ یہ مشورے تو عام طور پر دیے جاتے ہیں کہ مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں مگر عہدِ حاضر میں معاشی استحکام کے بغیر تعلیم دلانا کتنا مشکل ہے، شاید عشرت کدوں میں بیٹھے ہمارے سیاسی قائدین کو اس کا اندازہ نہیں، آج زمینی حقیقت یہ ہے کہ معاشی استحکام کے بغیر تعلیم نہیں اور تعلیم کے بغیر معاشی استحکام نہیں اور ملک کے مختلف گوشوں میں پس ماندہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ دونوں ہی چیزوں سے محروم ہے، ہمارے علما کا حال یہ ہے کہ وہ سرکار کا ارشاد الفقر فخری پڑھ پڑھ کر صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں، حالاں کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے جس میں انسانی زندگی سے متعلق تمام مسائل کا حل ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی ہر ایک سے متعلق جامع نظام موجود ہے، اسلام میں غریب و نادار اور یتیم مسلمانوں کی ہمدردی اور غم گساری باعثِ اجر و ثواب قرار دی گئی ہے۔ صفحۂ ہستی پر یہ مذہبِ اسلام ہی ہے جس نے انسانی غلامی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، مگر افسوس ہندوستانی سماج میں مسلمانوں کی فکری غلامی کا سلسلہ آج بھی باقی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک بڑی تیزی سے اسلام کے معاشی اور اقتصادی نظام سے اکتساب کر رہے ہیں۔ آج وقت کا تقاضا ہے کہ علماے کرام اسلام کے معاشی اصول اور بینکنگ نظام سے دنیا کو متعارف کرائیں۔ مگر افسوس! علما کو اپنی شعلہ بیانی اور سحر طرازی کے دوران اس کا احساس ہی نہیں رہتا کہ ایک بھوکا انسان مسلک و مذہب کی مہم کیا چھیڑے گا اسے اپنا مذہبی تشخص ہی بچانا دشوار ہے۔

آج ہمارے ملک میں کتنے ہی مقامات ہیں جہاں مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات اپنا مذہب ترک کر رہے ہیں۔ آندھرا کے رایلس اور تلنگانہ کے بعض غریب مسلمان اپنی حد درجہ مفلسی اور جہالت کی وجہ سے مرتد ہو رہے ہیں۔ بہار، بنگال اور آسام کے بعض علاقوں میں بھی اس قسم کے واقعات سامنے آرہے ہیں، کیوں کہ دیگر مذاہب کے لوگ ان کی معاشی اور دیگر بنیادی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں۔ غربت و افلاس کی وجہ سے ارتداد کی یہ افسوس ناک روش ملک کے دیگر پس ماندہ علاقوں میں بھی بڑھ رہی ہے۔ انھیں حالات سے فائدہ اٹھا کر اب قادیانی بھی جال پھینک رہے ہیں۔ غریب مسلمانوں کو دولت کا لالچ دے کر قادیانی مذہب میں داخل کر رہے ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے انسان کبھی کبھی بدترین گناہ کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ ملک کے بعض علاقوں میں آج افلاس کی ناگن نے مسلم خواتین کو اس منزل پر پہنچا دیا ہے کہ وہ دو وقت کے کھانے کے لیے اپنی عصمت فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ پس ماندہ مسلمانوں کے حال آشناؤں پر یہ تمام چیزیں پوشیدہ نہیں۔

یہ سچ اور حق ہے کہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ فقر میرے لیے باعث فخر ہے۔ مگر اسی کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بھی نظر میں رہنے چاہئیں۔

(۱) - فقر دونوں جہاں میں رسوائی کا سامان ہے۔ (۲) - فقر و محتاجی بسا اوقات کفر کا سبب بن جاتی ہے۔

دراصل سرکار علیہ السلام نے جس فقر کو اپنے لیے باعثِ فخر قرار دیا ہے، وہ یہ فقر و محتاجی اور غربت و افلاس نہیں جس کی وجہ سے آج ہزاروں مسلمان ارتداد اور بدمذہبی کی راہ اختیار کر رہے ہیں، فقر اور محتاجی کے حوالے سے حضرت سید شاہ حمزہ عینی مارہروی نے ان تینوں حدیثوں کی بڑی موثر اور دل پذیر تشریح فرمائی ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات آپ بھی پڑھ لیجیے:

"فقر کی دو قسمیں ہیں: (۱) - فقر اختیاری، (۲) - فقر اضطراری۔ یعنی فقر محمود بھی ہے اور مذموم بھی۔ "الفقر فخری" میں فقر محمود مراد ہے، چناں چہ اس فقر کی توصیف حدیث میں اکثر جگہ وارد ہے۔

دوسری حدیث: "الفقر سواد الوجه فی الدارین." میں فقر سے مراد مفلسی ہے۔ یعنی جو شخص محتاجی میں مبتلا ہو گا وہ تلاشِ رزق کے چکر میں عبادت سے محروم رہے گا اور عبادت میں مشغول بھی ہو تو ـــ ع: "پراگندہ روزی پراگندہ دل" کے مصداق بندگی کی حلاوت سے محروم رہے گا اور (محتاجی کے سبب) دنیا بھی اپنے ہاتھ میں نہیں۔ گویا دونوں جہاں میں اس کی روسیاہی ہے اور خویش و اقارب، یار و احباب، کسی کے نزدیک اس کی قدر نہیں۔ چناں چہ دانش مندوں کا قول ہے کہ اگر مفلس شخص میں سحبان جیسے فصیح کی فصاحت، ابن مقلہ جیسے خطاط کا خط، لقمان جیسے حکیم کی حکمت اور حضرت ادھم جیسے عارف کا زہد ہو، پھر بھی اس کی ایک درہم کے برابر بھی قیمت نہیں ہو گی، ہاں ہاں!

چو در کیسہ بو علی پول نیست سخن گرچہ سحر است معقول نیست

یعنی اگر بو علی کی تھیلی میں پیسہ نہیں تو سحر طراز گفتگو بھی بے معنیٰ ہے۔"

تیسری حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حضرت عینی رقم طراز ہیں۔

"تیسری حدیث "کاد الفقر ان یکون کفراً" کا پس منظر یہ ہے کہ بہت سارے مفلس تنگ دستی کی حالت میں جو کچھ منہ میں آتا ہے بے دریغ بک جاتے ہیں اور خدا اور رسول کا خیال نہیں رکھتے، اسی وجہ سے کفر کے قریب پہنچ جایا کرتے ہیں۔"

(کاشف الاستار، ص: ۵۲، بحوالہ اہل سنت کی آواز، ج: ۱۶)

حضرت سید شاہ عینی قدس سرہ العزیز نے احادیث نبویہ کی جو تشریح فرمائی وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ آج دعوت و تبلیغ اور عبادات و معاملات کے بہت سے مسائل معاشی استحکام پر موقوف ہیں اور موجودہ دور میں تو دولت کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ مرشدانِ طریقت ہوں یا داعیانِ شریعت، ان کی خاص توجہ کے نشانے وہی علاقے ہیں جہاں کے مسلمان معاشی خوش حالی سے شاد کام ہیں۔ اور یہ صورتِ حال دینی تقاضوں کے پیشِ نظر ہی ہے، کیوں کہ مدارس ہوں یا خانقاہیں، دعوتی تحریکیں ہوں یا تصنیفی ادارے دولت کے بغیر اس دور میں نہ کسی نظام کو زندہ رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے امام احمد رضا قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں:

"حدیث کا ارشاد ہے کہ آخر زمانہ میں دین کا کام بھی درہم و دینار سے چلے گا" اور کیوں نہ صادق ہو کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔" (فتاویٰ رضویہ، ج: ۱۲، ص: ۱۳۴)

غریب علاقوں میں جو بے راہ روی اور ارتداد کا رجحان بڑھ رہا ہے شاید بڑے علما اور بڑے پیرانِ طریقت کو اس کا اندازہ نہیں کیوں کہ ان علاقوں میں ان کے باضابطہ مدعو کرنے کی اہلیت نہیں۔ اور جہاں تک بساطِ سیاست کی مسلم لیڈر شپ کا سوال ہے تو انھیں تو ذاتی منفعت، پارٹی سے وفاداری اور اپنی کرسی بچانے کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

یہ کسی قدر طویل خامہ فرسائی ہم نے اس لیے کی ہے کہ دینی اور سماجی نقطۂ نظر سے معاشی اہمیت کا اندازہ ہو۔ علما اور داعیانِ اسلام بھی اپنے خطبات میں قوم کو تجارت و معیشت کی جانب متوجہ کریں۔ عقائد و ایمان کا تحفظ ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے، مگر امتِ مسلمہ کو ارتداد سے بچانا اور انھیں سماجی و معاشی استحکام دلانا بھی ہمیں اپنی قائدانہ اور داعیانہ ذمے داریوں میں شامل کرنا چاہیے۔ اور اس جمہوری نظام میں اس ذمہ داری سے سبک دوشی مضبوط سیاسی محاذ اور بھرپور سیاسی نمائندگی کے بغیر ممکن نہیں۔ ذہنی طور پر اگر آپ میرے قریب آگئے ہوں تو آیئے ہم مشترکہ طور پر اپنا روئے سخن بساطِ سیاست کی طرف موڑتے ہیں کہ ملک کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے ریزرویشن ضروری کیوں ہے؟

ہندوستان مختلف مذاہب اور مختلف برادریوں کا گلستان ہے۔ اس میں بیلا، چمیلی، جوہو، گیندا اور گلاب ہر قسم کے گل دستے ہیں۔ یہ چمن اسی وقت سرسبز و شاداب کہا جائے گا جب اس کا ہر گل دستہ پھل پھول رہا ہو۔ سوکھی شاخوں اور مرجھائی کونپلوں کے درمیان گلاب کا مسکراتا پھول بھی بے رونق معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی انسان کو صحت مند اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کے تمام اعضا صحیح و سالم اور صحت مند ہوں۔ اگر کسی انسان کے ہاتھ پیر چل دیے جائیں اور آنکھ، کان، ناک صحیح ہوں تو کوئی باشعور شخص اس دست و پا کچلے انسان کو صحت مند نہیں کہہ سکتا۔ درخشاں ہندوستان کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کا ہر باشندہ تعلیمی، اقتصادی اور جسمانی طور پر خوش حال اور خود کفیل ہو، علاقائی، مذہبی اور لسانی بنیاد پر مراعات سے محروم رکھنا آئین ہند کی اصول شکنی اور جمہوری تقاضوں کے منافی ہے۔

اس وقت ہندوستان کے تعلیمی، معاشی اور سیاسی حالات عدم توازن کا شکار ہیں۔ اکثریت کا ایک بڑا طبقہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے جب کہ اقلیت کا ایک بڑا طبقہ غربت و افلاس اور جہالت و پس ماندگی کی انتہائی پستی تک پہنچ چکا ہے۔ خاص طور پر ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلم قوم کی تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دیکھ کر ایک دردمند آنکھ سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ حالاں کہ حقوقِ انسانی سے متعلق آئینی دفعات کے جز ۳/ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ ملک میں کسی کے ساتھ کسی بھی بنیاد پر تفریق نہیں برتنی چاہیے۔ مگر افسوس راجندر سچر کی رپورٹ کے عین مطابق "بعض مسلم پس ماندہ ذاتوں کی حالت ہندو دلتوں سے بھی بدتر ہے۔" آج ہندوستان کے بعض علاقوں میں مسلم نٹ، کبھو، مہتر، حلال خور، خاک روب، لال بیگی، بھٹیارہ، کھٹک، مقری ترال، بھوئی، سائیں اور اسی طرح کی بہت سی مسلم برادریاں واقعی دلتوں سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ صورت میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جب یہی دلت مسلمان ہندو مذہب قبول کر لیتے ہیں تو انھیں وہ رعایتیں اور سہولتیں مل جاتی ہیں جو شیڈول کاسٹ کے لیے مخصوص ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی دلت ہندو اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو حکومت کی عطا کردہ وہ تمام سہولتیں ختم کر دی جاتی ہیں جو ہندو دلت ہونے کی وجہ سے اسے پہلے حاصل تھیں۔ کیا یہ مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا برتاؤ نہیں ہے؟ کیا یہ سہولت اور عدم سہولت مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے؟ اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اب بڑی تیزی سے پس ماندہ مسلمان ہندو مذہب قبول کر رہے ہیں تاکہ انھیں شیڈول کاسٹ کی مراعات حاصل ہوں۔ لالو پرساد یادو جب بہار کے وزیر اعلیٰ تھے تو ان کے باڈی گارڈوں میں ایک راجیش خلیفہ بھی تھے۔ بہار میں عام طور پر خلیفہ کا ٹائٹل مسلم نٹ یا کبھو برادری کے لوگ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ دریافت کرنے پر راجیش خلیفہ نے بتایا کہ میں نے اپنا نام اجمل سے راجیش اور بیوی کا نام بتول سے سیتا کر لیا ہے۔ اجمل خلیفہ نے اپنے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو یہ نوکری مجھے نہیں ملتی۔ اجمل خلیفہ کو یہ نوکری مذہب بدلنے کی وجہ سے ملی ورنہ ذات کی بنیاد پر وہ مذہب بدلنے سے پہلے بھی خلیفہ تھا اور مذہب بدلنے کی بعد بھی خلیفہ ہی رہا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ بچہ مزدوری بھی قانونی جرم ہے، مگر ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر

بتایئے جس کے گھر دو وقت سے چولہا نہیں جلا ہو، بدن ڈھکنے کے لیے کپڑا نہ ہو، وہ پہلے بھیک مانگ کر یا مزدوری کر کے پیٹ کی آگ بجھائے گا یا اسکول میں جا کر ایڈمیشن لے گا۔ مفت تعلیم بھی اسی وقت حاصل کی جا سکتی ہے جب دو وقت کا کھانا میسر ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اسی معاشی اور سماجی پس ماندگی کے پیش نظر یو. پی. اے. سرکار نے سچر کمیٹی اور رنگاناتھ مشرا کمیٹی کی تشکیل دی تھی۔ سچر کمیٹی کی ذمے داری مسلمانوں کی معاشی اور سماجی حیثیت کا جائزہ لینا تھا، جب کہ رنگاناتھ مشرا کمیٹی کی ذمہ داری ریزرویشن پر از سر نو غور کرنا تھا کہ ریزرویشن سے اب تک کتنا فائدہ پہنچا ہے اور اسے **مزید** بہتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ قومی کمیشن برائے مذہبی اور لسانی اقلیتیں ۲۹/ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کے سربراہ **سپریم کورٹ** آف انڈیا کے ریٹائرڈ جج چیف جسٹس رنگاناتھ مشرا تھے۔ کمیشن نے ۲۲/ مئی ۲۰۰۷ء کو اپنا جائزہ اور سفارشات برسر اقتدار حکومت کو **سونپ دی** تھیں۔ مگر افسوس قریب دو برس تک یہ رپورٹ سرد خانے میں پڑی رہی۔ خیر خدا خدا کر کے ۱۸/ دسمبر ۲۰۰۹ء کو حکومت نے یہ **رپورٹ پارلیمنٹ** میں پیش کر دی۔ رپورٹ خلافِ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے قبل لیک ہو گئی تھی اس لیے بھی اقلیتوں کا دباؤ تھا کہ اسے **جلد از جلد** پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے تاکہ مسلمانوں کی پس ماندگی دور ہونے کا راستہ صاف ہو۔ مشرا کمیشن کی سفارشات باضابطہ منظر عام پر **آنے کے بعد** اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اپوزیشن کا دباؤ محسوس کیے بغیر اگر حکومت نے مشرا کمیشن کی سفارشات کو **عملی** شکل دے دی تو دنیا بھر میں ہندوستان کی ایک خوب صورت تصویر ابھر کر سامنے آئے گی۔

رنگاناتھ مشرا کمیشن کی سفارشات کے چند خاص گوشے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱. پچھڑی ذاتوں کی شناخت میں اکثریت اور اقلیت میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اقلیتی فرقے کو وہی مراعات ملنی چاہئیں جو اکثریتی طبقے کو مل رہی ہیں۔

۲. اقلیتوں میں موجود شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب افراد کو وہی مراعات ملنی چاہئیں جو اکثریتی فرقے کے تمام افراد کو ملتی ہیں۔ اقلیتی فرقے کے تمام پس ماندہ افراد اور پس ماندہ ذاتوں کو وہی درجہ ملنا چاہیے جو اکثریتی فرقے کی ان ذاتوں کو مل رہا ہے۔

۳. آئین کی دفعہ ۳۴۱/ میں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لیے ریزرویشن کا نظم ہے، لیکن شروع میں ایک صدارتی حکم نامے کے **ذریعے** اس دفعہ کا فائدہ صرف ہندو درج فہرست ذاتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ بعد میں حکومت نے اس میں ترمیم کر دی اور سکھوں اور **بودھ مذہب** کے ماننے والوں کی درج فہرست ذاتوں کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ مسلمانوں، عیسائیوں، جینیوں اور پارسیوں کو شیڈول کاسٹ سے خارج رکھا گیا۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ ان ہی ذاتوں کے مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو بھی شیڈول کاسٹ کا درجہ ملنا چاہیے۔

۴. رنگاناتھ مشرا کا کہنا ہے کہ منڈل کمیشن کی زمرہ بندی کے مطابق ملک میں او. بی. سی. کے ۲۷/ فیصد کوٹے میں اقلیتوں کی (او. بی. سی.) کی آبادی ۸،۴ فیصد ہے۔ لہٰذا ان کے لیے اسی تناسب سے ریزرویشن ہونا چاہیے۔ اس کوٹے سے مسلمانوں کو ۶/ فیصد ریزرویشن ملنا چاہیے اور غیر مسلم اقلیتوں کو ۲،۴/ فیصد ریزرویشن ملنا چاہیے۔

۵. سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔ بعض اداروں میں تو ان کی بالکل نمائندگی ہی نہیں۔ لہٰذا ان کو آئین کی دفعہ ۱۶ (۴) کے تحت پس ماندہ قرار دیا جانا چاہیے۔ لہٰذا مرکزی سرکار اور ریاستی سرکار کی تمام ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں اقلیتوں کے لیے ۱۵/ فیصد ریزرویشن ہونا چاہیے۔ ۱۵/ فیصد میں مسلمانوں کے لیے ۱۰/ فیصد مخصوص کر دیا جائے اور باقی ۵/ فیصد ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے لیے کوٹہ خاص کر دینا چاہیے۔

۶. تمام فلاحی اور سماجی اسکیموں جیسے نریگا اور وزیر اعظم یوجنا وغیرہ میں اقلیتوں کو ۱۵/ فیصد ریزرویشن دیا جانا چاہیے۔ ۱۰/ فیصد مسلمانوں کو اور ۵/ فیصد دیگر اقلیتوں کو۔

رنگاناتھ مشرا کمیشن کی ان سفارشات کی روشنی میں پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت نیک نیتی سے غور کر کے اگر ان کو نافذ کر دے تو بڑی حد تک مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سماجی زبوں حالی کو سہارا **مل سکتا** ہے اور چند ہی سالوں میں مسلمانوں کی بدحالی خوش حالی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ مسلم ریزرویشن کی تائید میں آندھرا پردیش کی ہائی کورٹ **کا ایک** فیصلہ پہلے ہی آ چکا ہے۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا

ہے کہ "مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کو سیکولرازم کی ضد قرار دینا مناسب نہیں ہے، اس کے برعکس اگر کسی گروہ کو اس بنیاد پر ریزرویشن سے محروم رکھا جاتا ہے تو یہ بات سیکولرازم کے منافی ہو گی۔" سچی بات یہی ہے کہ پریشان حال اقلیتوں کو مساوی سطح پر لانے کے لیے خصوصی اقدامات کرنا سیکولرازم کے منافی نہیں بلکہ سیکولرازم کا بنیادی تقاضا ہے۔

منڈل کمیشن نے ۲۷/ فیصد ریزرویشن کا نظم پس ماندہ برادریوں کے لیے کیا تھا۔ لیکن تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۲ء سے اب تک اس ریزرویشن کا فائدہ ۲/ فیصد مسلمانوں کو بھی نہیں مل رہا ہے۔ بہار میں منڈل کمیشن کے نفاذ سے قبل سرکاری نوکریوں میں ۱۲/ فیصد مسلمان تھے آج وہاں ۲/ فیصد بھی نہیں۔ قریب قریب یہی صورت حال ملک کے دیگر علاقوں میں بھی ہے۔ رنگاناتھ مشرا کمیشن نے انھیں حالات کے پیشِ نظر مجموعی طور پر تمام مسلمانوں کو بیک ورڈ تسلیم کرتے ہوئے انھیں ۱۰/ فیصد ریزرویشن دینے کی سفارش کی ہے۔

جسٹس رنگاناتھ مشرا کمیشن نے ریزرویشن کے حوالے سے جو رپورٹ پیش کی ہے بی. جے. پی. وغیرہ غیر مسلم جماعتیں تو یقیناً اس کی شدید مخالفت کریں گی اور کر بھی رہی ہیں۔ مگر ایک خدشہ یہ بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ بعض مسلم سیاسی لیڈران بھی اس کی مخالفت میں میدان میں آئیں گے کیوں کہ مشرا کمیٹی کی سفارشات اور ان کے نفاذ سے ان کی مسلم سیاسی ٹھیکے داری کو دھچکا لگے گا۔ دوسری طرف ملائم سنگ یادو، لالو پرساد یادو اور رام ولاس پاسوان اس کی حمایت کے لیے میدان میں کود پڑے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ان سیاسی بازی گروں کی شدید حمایت سے کہیں شدید مخالفت کی راہ ہموار نہ ہو جائے اور کہیں بابری مسجد کی طرح جذباتی مدعا بن کر مشرا کمیشن کی رپورٹ بھی شہید نہ ہو جائے۔ دیکھیے اب آگے کیا ہوتا ہے۔ ☆☆☆

رنگاناتھ مشرا کمیشن

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور دانش ورانِ ملت؟

مولانا ادریس بستوی

—— نائب ناظم جامعہ اشرفیہ، مبارک پور ——

حکومتِ ہند کو چاہیے کہ رنگاناتھ مشرا کمیشن کی سفارشات کو فوراً نافذ کرے۔ اس کی تاخیر سے حکومت کی بھی بدنامی ہوگی اور کانگریس کی بھی۔ آج مسلمان جس منزل پر پہنچ چکا ہے اور جس پس ماندگی کا شکار ہے، اس سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن دیا جائے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی ہمہ جہت پس ماندگی دور نہیں ہو سکتی۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ او.بی.سی. میں پس ماندہ مسلمانوں کا کوٹہ الگ کر دیا جائے تاکہ غریب مسلمان اس کا فائدہ پا سکیں۔

مولانا خوشتر نورانی

—— مدیرِ اعلیٰ ماہ نامہ جامِ نور، دہلی ——

رنگ ناتھ مشرا کمیشن کے قیام کا مقصد مذہبی و لسانی اقلیتوں کی پس ماندگی کو سامنے لاتے ہوئے انھیں سرکاری نوکریوں میں ریزرویشن کی سفارش دینا تھا۔ کمیشن نے تو مئی ۲۰۰۷ء میں ہی اپنی رپورٹ وزیر اعظم منموہن سنگھ کو سونپ دی تھی، لیکن حکومت نے اس رپورٹ کو ۱۸؍دسمبر ۲۰۰۹ء کو پارلیمنٹ میں پیش کیا، شاید اس تاخیر کی وجہ صحیح وقت کی تلاش تھی۔ افسوس! ایک بار پھر ہندوستانی مسلمان اسے امید کی ایک کرن کے طور پر دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ قرائن بتا رہے ہیں کہ اس اقلیتی کمیشن کا حال بھی ماضی کے کمیشنوں سے مختلف نہیں ہوگا۔

مسلمان اب تک اس بات کو سمجھ نہیں سکے ہیں کہ ان تمام کمیشنوں کی حیثیت محض "سفارشات" کی ہوتی ہے، قانونی طور پر ان کی اتنی اہلیت نہیں کہ وہ اپنی رپورٹوں کو اپنی مرضی سے نافذ کر سکیں یہی وجہ ہے کہ نہ تو لبراہن کمیشن بابری مسجد کے بھگوا مجرمین کا کچھ کر سکا اور اب نہ رنگاناتھ مشرا کمیشن اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کر سکے گا۔ ان کمیشنوں کا کام حکومتوں کو مشورہ دینا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لیے مسلمان اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کمیشنوں، کمیٹیوں اور سفارشات پر ان کی ترقی نہیں ہو سکتی، بلکہ جن بنیادوں پر وہ پس ماندگی کا شکار ہیں انھیں دور کرنے کے لیے وہ خود ہی جدوجہد کریں تو بات بن سکتی ہے۔ اب تک کے تمام کمیشنوں اور کمیٹیوں نے مسلمانوں کی پسماندگی کی بنیادی وجہ تعلیم سے غفلت بتائی ہے، یہ غلط بھی نہیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں، اپنے علاقوں میں معیاری تعلیمی ادارے قائم کریں اور بچیوں کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کریں۔ کمیشن کا قیام ووٹ بینک کی سیاست ہے، جو مسلمانوں کو اپنے مقاصد سے دور کر کے بنام ریزرویشن "دوسروں پر انحصار" کے اسباق پڑھا رہی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ خود اپنی پس ماندگی کے خلاف جدوجہد کریں اور بنام اہلیت اپنے حقوق حاصل کریں۔

جسٹس احمدی

—— سابق چیف جسٹس آف انڈیا ——

ملک میں جب سماجی انصاف کی بات چلتی ہے تو اس میں اقلیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان اس وقت بے اعتنائی اور توہین آمیز رویے کے شکار ہیں۔ سچر کمیٹی اور جسٹس رنگاناتھ مشرا کمیٹی نے ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی پس ماندگی، ان کی غربت اور بے روزگاری کے مسئلہ پر جس طرح تفصیلی جائزہ کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی ہے وہ انتہائی بھیانک ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ملکی ترقی کی بات کی جاتی ہے اور ہر طرف شرحِ نمو میں اضافہ پر ہم فخر کرتے ہیں تو ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو کیسے فراموش کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ اتنی بڑی اقلیت کی بدحالی کے ہوتے ملک کو ہم خوش حال اور ترقی یافتہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ جسٹس سچر نے جس طرح اپنے جائزہ میں تفصیل سے مسلمانوں کی پس ماندگی پیش کی ہے اور اس کو دور کرنے کے جو طریقے بتائے ہیں، افسوس! کہ ان پر آج تک کسی حکومت نے بھی صدقِ دل سے عمل در آمد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح رنگاناتھ مشرا کمیشن نے جب دلت اور پس ماندہ مسلمانوں کو اس طرح ریزرویشن دینے کی بات کی جس طرح دیگر مذاہب کے دلتوں کو سہولیات دی گئی ہیں۔ لیکن اس جانب نہ جانے کیوں لوگ انصاف کرنے سے ڈرتے ہیں اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس مسئلہ کو ٹال دیا جائے۔ سچر کمیٹی اور رنگاناتھ مشرا کمیٹی کی رپورٹ سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ ملک میں سماجی انصاف کے اصول کا نفاذ پوری طرح سے نہیں ہو پایا۔

شاہد صدیقی

—— ایڈیٹر ہفت روزہ نئی دنیا، دہلی ——

جسٹس رنگاناتھ مشرا کی رپورٹ جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو روزگار اور تعلیم میں ۱۵؍فی صد ریزرویشن دینے کی سفارش کی گئی ہے، اگر اس کی ۵۰؍فی صد سفارشات پر بھی عمل ہو جائے تو اس سے مسلمانوں کا پچھڑا پن دور کرنے میں زبردست مدد ملے گی۔

ڈاکٹر شکیل صمدانی

—— شعبۂ قانون، اے. ایم. یو. علی گڑھ ——

رنگاناتھ مشرا کمیشن کی سفارشات قابلِ تحسین ہیں اور مسلمانوں کے حق میں ہیں۔ اگر ایمان داری کے ساتھ ان کا نفاذ کر دیا جائے تو مسلمانوں کے اچھے دن لوٹ سکتے ہیں، بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور ان کی پس ماندگی دور ہو سکتی ہے اور ایک بار پھر وہ ملک کی مین اسٹریم میں شامل ہو سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ موجودہ یو.پی.اے. حکومت ان سفارشات کو نافذ کرے۔

پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم

—— سابق ڈائریکٹر رنگاناتھ مشرا کمیشن ——

چوں کہ یہ رپورٹ مسلمانوں کے لیے سب سے مضبوط اور قابلِ بھروسا معاشی ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔ مشرا کمیشن رپورٹ سچر کمیشن رپورٹ کی طرح محض حقائق کا گوشوارہ نہیں بلکہ ایک ایسی معتبر دستاویز ہے جس میں معاشی اعتبار سے بے حد پس ماندہ مسلمانوں کی پس ماندگی دور کرنے کے لیے بادی النظر میں مکمل میکنزم محض میکانی نظریے کی شکل میں نہیں بلکہ ایک مکمل حکمتِ عملی اور ممکن الحصول ہدف کی شکل میں موجود ہے جو اقلیتی امور کی وزارت کو اس ضمن میں قابلِ عمل روڈ میپ تیار کرنے کے لیے ضروری مواد فراہم کرتی ہے۔ اب تو بات صرف نیت اور سیاسی قوتِ ارادی کی ہے۔ اقلیتوں اور ان کے ہم درد افراد اور انجمنوں کو بھی چاہیے کہ وہ برابر دباؤ بنائے رکھیں۔

امتیاز عالم مصباحی

—— ریسرچ اسکالر جے.این.یو. نئی دہلی ——

مرکزی حکومت نے مسلمانوں کی پسماندگی کا پتا لگانے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لیے دو کمیشنوں کی تشکیل دی تھی۔ ایک کا نام سچر کمیٹی رکھا گیا جب کہ دوسرے کا نام رنگاناتھ مشرا کمیشن۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ سچر کمیٹی مسلمانوں کے سماجی، معاشی اور تعلیمی حالات کا پتا لگانے کے لیے تشکیل دی گئی جبکہ مشرا کمیشن مسلمانوں کے ریزرویشن کے تعلق سے بنایا گیا تھا۔ مشرا کمیشن کو یہ پتا لگانا تھا کہ آیا مسلمانوں کو ریزرویشن دیا جا سکتا ہے کہ نہیں اور اگر دیا جا سکتا ہے تو کس بنیاد پر اور کس طرح؟ یہی وجہ ہے کہ مذہبی اور لسانی اقلیتوں سے متعلق قومی کمیشن کی رپورٹ کو سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد کے قدم کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو دو طرح کے ریزرویشن کا فائدہ ملے گا پہلے ایس. سی. ریزرویشن کا اطلاق صرف ہندوؤں، سکھوں اور بودھوں پر ہوتا ہے اس کی توسیع کی جائے گی اور دلت عیسائیوں اور مسلمانوں کو بھی ایس. سی. یعنی درج فہرست ذاتوں میں شامل کیا جائے گا۔ دوسری سفارش یہ ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم اور ملازمت کے معاملے میں مرکز اور ریاستوں میں دس فیصد ریزرویشن ملنا چاہیے اور دیگر اقلیتوں کو پانچ فیصد یعنی کل ملا کر پندرہ فیصد۔ یقینی طور پر یہ ایک مثبت قدم ہوگا۔

دراصل شق ثانی کے مطابق اس ریزرویشن کا فائدہ صرف پسماندہ مسلمانوں یعنی او.بی.سی. میں شامل مسلمانوں کو ہوگا۔ اگر سارے مسلمانوں کو شامل کر لیا جائے تو اس میں کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو سماجی اور تعلیمی اعتبار سے آرٹیکل (۴) ۱۵؍ کے زمرے میں شامل نہیں ہوتے چوں کہ آئین ہند کے آرٹیکل (۴) ۱۵؍ کے مطابق ریزرویشن کے لیے سماجی اور تعلیمی پس ماندگی ضروری ہے۔ اس سے دو طرح کے مسائل پیدا ہونے کا خطرہ ہے ایک تو یہ کہ آزادی سے پہلے ہی مسلمانوں کی سیاست اس سوال پر مرکوز رہی ہے کہ مسلمان ایک ہیں اور ان کے اندر ذات پات نہیں ہے، اپنے آپ میں یہ بات نہ پہلے سچ تھی اور نہ اب سچ ہے۔ اندر سے مسلمان اسی قدر منقسم ہیں جتنے اس ملک میں دوسرے مذہب کے ماننے والے لوگ لیکن اکثر مسلم رہ نما مسلم معاشرے میں موجود اس عصبیت سے انکار کرتے ہیں، انکار کی وجہ یہ نہیں کہ مسلمان منقسم نہیں ہیں بلکہ یہ ان کی سیاسی ضرورت رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو متحد قوم کی شکل میں پیش کریں۔ مسلمانوں کے مذہبی رہنما، جن کا سیاست سے ایک عرصے سے تعلق رہا ہے، وہ بھی مساوات کی دہائی دے کر یہ کہتے رہے ہیں کہ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور ان میں طبقاتی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی کہہ دے کہ مسلمانوں میں ذات پات ہے یا مسلمانوں میں طبقاتی اعتبار سے فرق ہے تو ان کا الزام یہ ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو بانٹنے کی ایک سازش ہے۔ ایسی صورت میں صرف پس ماندہ مسلمانوں کے اس بڑے حصے کے حقوق کو نظر انداز کر دیں گے، جو پس ماندہ ہے اور جس کے لیے ریزرویشن ترقی کا ایک راستہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال سے مسلم لیڈران اور مذہبی رہ نماؤں کو اپنے موقف پر نظر ثانی کر کے مسلمانوں کے پسماندہ طبقات کو اوپر اٹھنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ چوں کہ ریزرویشن کے فوائد سے کون انکار کر سکتا ہے، مثلاً آندھرا پردیش میں چار فیصد پس ماندہ مسلمانوں کو ریزرویشن مل رہا ہے جس سے وہاں کے مسلمان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تمل ناڈو میں بھی چار فیصد ریزرویشن مل رہا ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت شامل ہے اس رپورٹ سے اسی وقت فائدہ ہوگا جب رپورٹ پر کاروائی رپورٹ بھی پیش ہو۔ حالاں کہ کاروائی رپورٹ پر حکومت کا رویہ واضح نہیں۔ اگر یہ رپورٹ من و عن لاگو کر دی گئی تو چند دہائیوں میں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے ہندوستانی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو ترقی کرنے کا سنہرا موقع ملے گا۔

فکر امروز

جدید علمِ کلام

دوسری قسط

مولانا محمد اسحاق مصباحی

جب علم کلام کا دوسرا دور شروع ہوا، یعنی فلسفۂ یونان کے منتقل ہونے کے بعد اس وقت سے علم کلام کے مباحث کی ابتدا **"موجود"** کے احوال سے شروع ہوئی اور اس طرح ہم جن چیزوں کو دیکھتے ہیں **اور** احساس کرتے ہیں وہ اشیا اپنا ایک وجود اور حقیقت رکھتی ہیں اور انسان **کو** ان کا علم حاصل ہے اور وہ علم واقع اور حقیقت کے مطابق ہے۔ **لہٰذا** عقل انسانی عالم کے موجودات کو عرض اور جوہر میں منقسم سمجھتی ہے **اور** موجود کی یہ دونوں قسمیں عدم سے وجود میں آئی ہیں اور جب یہ عدم سے وجود میں آئی ہیں تو ان تمام ممکنات اور عدم سے موجود ہونے والی اشیا کا خالق ایسی ذات ہو گی بلکہ ہے جو ممکنات کا غیر ہے اور اس عالم کے احکام سے پاک ہے۔ اگر ممکنات کا خالق نہ مانا جائے تو ممکنات کا سلسلہ علت کی تلاش میں ایک غیر متناہی سلسلہ پر موقوف ہو گا اور یہ محال ہے۔

اور وہ ذات جو خالق ہے، واجب الوجود ہے، قدیم ہے، ارادہٗ قدرت سے متصف ہے، واحد ہے، عالم ہے، مشیت والی ہے، یعنی اس کی کچھ صفات ثبوتیہ ہیں اور کچھ صفات سلبیہ ہیں۔ یعنی کچھ صفات سے موصوف ہونا ضروری ہے اور کچھ سے پاک ہونا ضروری ہے۔

یہاں تک یہ مندرجہ ذیل مباحث ذکر ہوتے ہیں:

اشیا کے حقائق ثابت ہیں۔ انسان کی نظر اور فہم درست ہے۔ ممکنات کا سلسلہ انتہا والا ہے اور یہ عالم حادث ہے، قدیم نہیں ہے۔ قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ ان قواعد کے خلاف تھا۔ کچھ حقائق کو سراب اور خیال کہتے تھے اور کچھ حقائق کو اپنی نظر اور سوچ کے تابع کہتے تھے اور نظر و عقل کے فیصلہ کو غیر یقینی کہتے تھے اور کچھ نظر و عقل سے درست علم حاصل ہونے کے منکر تھے۔ ان کو عندیہ، عنادیہ اور لاادریہ کے نام سے متکلمین نے ذکر کیا ہے۔ اور کچھ عالم کو قدیم کہتے تھے اور کچھ مادہ اور مقدار و صورت کو قدیم کہتے تھے۔

موجودہ دور میں عندیہ فرقہ کے نظریات کا تو ذکر نہیں ملتا، البتہ دو گروہ سائنس داں حضرات میں مشہور ہیں۔ آج کا ایک گروہ غیر یقینیت کا قائل ہے، یعنی وہ عقل اور نظر کے فیصلے کو مانتا تو ہے مگر وہ اس کو حتمی نہیں مانتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عقل کے فیصلہ کو آخری صدق اور یقین نہیں کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ گزشتہ صدیوں کے فیصلوں کے خلاف آج کے تجربات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آج کے فیصلوں کے خلاف کل کے تجربات ہوں۔

اور ایک دوسرا گروہ عالم کے قدیم ہونے کا آج بھی قائل ہے۔ ان لوگوں میں کچھ تو مدبر عالم کے وجود کے قائل ہیں اور کچھ نہیں۔ اصل میں اسلام کے علاوہ مذاہب اور نظریات خالق کائنات اور انسان کے علم کے تعلق سے ایک تاریک راستے میں گم ہیں۔ جب ہم ان لوگوں کے اقوال اور خیالات کو جمع کر کے دیکھتے ہیں تو اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی نور کی تلاش میں ہیں جو ان کو تاریکیوں سے نکال سکے۔ اسی لیے مومن کا ایمان اس دنیا میں ایک مینارۂ نور ہے۔

اقبال کہتے ہیں۔

گماں آباد دنیا میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

تو جو لوگ غیر یقینیت کے قائل ہیں وہ اگرچہ "لاادریہ" کے ہی قریب ہیں، مگر جدید دور میں فلاسفہ نے اس پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ لوگ اس نظریہ کا موجد مشہور جرمن ریاضی داں ورنر ہاسن برگ (م: ۱۹۲۶ء) کو مانتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یونان میں بھی عندیہ، لاادریہ اور عنادیہ مذہب کے ماننے والے فلاسفہ موجود تھے۔

اس نظریہ کے متعدد پہلو ہیں:

۱۔ ہم نے جس شے کو جیسا تصور کیا ہے وہ اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔
۲۔ کائنات کے موجودہ نظام کو سمجھنا مشکل ہے تو آئندہ کے تعلق سے بھی کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔
۳۔ تمام فزیکلی تجربات حتمی نہیں ہیں۔

شیخ الحدیث جامعہ رضویہ، کیمری، ضلع رام پور

اس نظریہ کو اگر ہم فزکس (Physics) یعنی طبیعیات سے آگے بڑھاتے ہیں تو یہ نظریہ اسلام کے عقائد کے خلاف ہے اور جتنی چیزیں بھی ایمان کا جز ہیں، جیسے جنت، دوزخ، حساب، حشر و نشر، ان سب کے ایمان کے خلاف ہے۔

اب اس نظریہ کے علمی رد کا طریقہ یہ ہے کہ کائنات میں اس کے قائل کم از کم اپنے وجود پر تو یقین رکھتے ہیں اور اپنے اس غیر یقینیت کے فیصلے اور حکم پر تصدیق کرتے ہیں تو دو چیزوں پر وہ کم از کم یقین کے قائل ہوئے، لہٰذا ہم بھی ایمان کے سلسلے میں کچھ امور پر یقینیت کے قائل ہیں تو آپ کو اعتراض کیوں؟

ہاں! اگر اس نظریہ کو صرف فزکس کے تجربات پر محدود رکھا جائے اور یہ کہا جائے کہ اشیاے مادیہ کی تحلیل، ترکیب، انفعال، تاثر، تاثیر، ری ایکشن، عناصر کی مقدار، حقائق، افعال اور خاصیات کے تعلق سے تجربات حتمی نہیں ہیں تو پھر اس نظریہ کا کوئی ٹکراؤ اسلام سے نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو درجہ بہ درجہ علم دیتا ہے اور یہی اس کی عادتِ کریمہ ہے اور علم انسان کے لیے دیا ہوا ہے، پھر بھی یہ علم کائنات کے رازوں کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔

وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔

تعیین مقصد حیات

جو لوگ خالقِ کائنات کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک یہ حیاتِ انسانی کسی مقصد کے تحت نہیں ہے بلکہ کل کائنات اور اس میں رہنے والے جان دار کسی مقصد کے لیے نہیں ہیں۔ اور یہ گروہ روح کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی خلیے کے مرکز میں ۴۶ ر کروموسومز ہوتے ہیں اور ان میں مشمول جین ڈی۔ این۔ اے۔ کو لیے ہوتے ہیں۔ اس کی چار حرفی زبان اگلے خلیے کو منتقل ہوتی ہے اور یہ چکر حیات کہلاتا ہے اور یہ چکر تمام جان داروں میں ایک سرکل مشین کی طرح کام کرتا ہے، لہٰذا ہر ایک جان دار صرف ایک مشین ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں، اس میں کوئی روح نہیں، اس کا کوئی خالق نہیں۔

اس مذہب کا علمی رد یہ ہے کہ جان داروں میں کروموسومز اور D.N.A. کا نظام اس مادہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نظام کا وجود نہ تو روح کے وجود کے منافی ہے اور نہ ہی اس کے عدم کو مستلزم۔ لہٰذا اس سے روح اور مقصد کی نفی کرنا ایک دعویٰ بلا دلیل ہے اور خواہ مخواہ کا مکابرہ ہے۔ اس مذہب اور نظریہ کو آج کے دہریے اور منکرین خدا بہت زور و شور سے بیان کرتے ہیں۔ یہ نظریہ مسلمانوں کے ایمان کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں ان پر خالق کے انکار کے ساتھ ساتھ تمام احکاماتِ ایمان و اسلام کا انکار بھی لازم آتا ہے۔ اس نظریہ کو آج کل سائنس کے نقاب میں ملحد بہت توجہ دے کر پڑھاتے ہیں تا کہ اہلِ ایمان کا ایمان اور عقیدہ سلب کر سکیں۔

اعتراف، خالق کائنات کے بعد

جو مذاہب اور نظریات باریِ تعالیٰ کے خالق ہونے اور موجود اول ہونے پر یقین رکھتے ہیں، ان میں اور اسلام کے عقائد میں فرق ہے، اس کی تفصیل میں بہت فرق ہے، لیکن بعض مذاہب ریاضت بھی عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ اسلامی عقیدہ میں رب تعالیٰ کی صفات وجودیہ ہیں:

وجودِ ذاتی، قِدم ذاتی، وحدت، حیات، ازلیت و ابدیت، علم، قدرت، ارادہ، مشیت، تکوین، سمع و بصر۔

اور کچھ صفات سلبیہ ہیں یعنی بعض ایسی چیزیں ہیں کہ ان سے پاک ماننا ضروری ہے۔ وہ حادث نہیں، اس کے لیے فنا نہیں، اس کے لیے زمان و مکان کا ثبوت محال ہے، حیز اور جہت اس کے لیے محال ہے، اس کا کسی شکل و صورت پر ہونا محال، اس کا کسی مخلوق میں حلول کرنا، او تار بننا محال۔ غرض وہ ان تمام چیزوں اور عیوب سے پاک ہے جو اس کے صفاتِ وجودیہ کے منافی اور متصادم ہیں۔

یہاں پر بعض مذاہب اسلامی عقیدہ کے خلاف ہیں، مثلاً جو مذاہب اس عالم کو قدیم کہتے ہیں، یا جو اس کے لیے اعضا ثابت کرتے ہیں، یا جو اس کی شکل ثابت کرتے ہیں، یا جو واجب کے کسی مخلوق میں حلول و سرایت کرنے کے قائل ہیں یا جو خالقِ کائنات کے کسی مخلوق کی صورت میں جنم لینے کے قائل ہیں:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝
وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

بعض اسلامی عبارتوں میں ایسے الفاظ کا ذکر ہے جن سے بظاہر یہ دلالت ہوتی ہے کہ خالقِ کائنات کے لیے ید، جہت، ساق اور نزول ثابت ہے۔ مگر دوسری آیتوں میں ان چیزوں کی نفی بھی ہے۔ تو پہلی قسم کی آیتوں اور احادیث کو "متشابہات" کہا جاتا ہے، ان پر صرف ایمان لانا واجب ہے اور ان کی حقیقت کی تلاش منع۔ بلکہ ان کا ذکر اور

نزول اسی لیے ہوا کہ ایمان والوں اور عقل پرستوں میں امتیاز رہے۔

باری تعالیٰ کی صفات کے سلسلے میں معتزلہ اور اہل سنت کا مشہور تنازع رہا ہے اور وہ مسئلۂ صفات ہے۔ معتزلہ واجب کی صفات کو عین کہتے ہیں اور اہل سنت ان صفات کو نہ عین کہتے ہیں اور نہ غیر۔ اصل میں اہل سنت واجب تعالیٰ کی اکثر صفات میں شرع کے بیان سے آگے نہیں جاتے اور معتزلہ فلسفیوں کی طرح عقلی تحقیق سے حل کرنا چاہتے ہیں اور وہ صفات واجب کو قدیم کہنے سے ڈرتے ہوئے حقیقت میں ان کی نفی کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستانی مذاہب میں آریوں میں چند لوگ حلول کے قائل نہیں ہیں اور وہ واجب و خالق کو نرنکار (निरंकार) مانتے ہیں اور بت پرستی کے خلاف ہیں مگر وہ چوں کہ نبوتِ محمدی کے قائل نہیں لہٰذا وہ یوں اسلام کے عقیدہ سے الگ ہیں، باقی اور ہندوستانی مذاہب جیسے جین مذہب اور بودھ مذہب، تو یہ روحانیت کے نظام کے ساتھ ساتھ نبوت اور واجب کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس سناتن دھرم کے لوگ حلول اور واجب کے مخلوق کی شکل میں جنم لینے کے قائل ہیں۔ اسی لیے ان مذاہب کے بانیوں کو اہل اسلام نبی اور پیغمبر نہیں کہتے اور ان مذاہب کے مآخذ بھی تاریخی اعتبار سے مشکوک ہیں۔ ان کے پاس عقائد کی تفصیل بھی نہیں۔ بودھ اور جین مذہب میں اول تاملِ نفسی کا قائل ہے اور دوسرا فطرت کے اصول کا، یہ مذاہب تمام عقائد اور سیاسی نظام سے بحث نہیں کرتے۔

تشریحات واجب تعالی

اہل سنت کا اتفاق ہے کہ خالقِ کائنات عیوب سے پاک ہے اور ان عیوب میں کذب بھی ہے لہٰذا وہ اس سے بھی پاک ہے۔ یعنی اس کی قدرت کذب کو شامل نہیں ہے۔ اسی طرح وہ امور جو اس کے وجوبِ ذاتی کے خلاف ہیں جیسے خود کو فنا کرنا، وہ ان تمام امور سے پاک ہے اور اس کی قدرت ان محالات پر شمول نہیں رکھتی۔

قال فی النبراس: "أما عدم القدرة على المحال فليس بنقصان لأن تعلق الارادة به محال فلا عجز و قال بعض الاكابر بل هذا نقص فی المحل حيث لم يستعد لتعلق القدر به. (النبراس، ص:۱۲۳)

(ترجمہ) اب قدرت کا تعلق محال سے نہ ہونا تو یہ قدرت کے لیے کمی اور عیب نہیں ہے۔ اس لیے اس محال سے ارادہ کا تعلق محال ہے تو عاجز ہونا لازم نہیں۔ بعض بڑے ائمہ نے فرمایا کہ یہ محل میں کمی ہے کہ وہ قدرت و ارادہ کے تعلق کے لائق صلاحیت نہیں رکھتا۔

موجودہ دور میں دیوبندی فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ خالق کائنات کے لیے کذب محال نہیں بلکہ ممکن ہے۔ ان کے مولوی رشید احمد نے واجب تعالیٰ کے لیے کذب بالفعل مانا۔ امام احمد رضا خاں نے ان کے اس عقیدہ کا رد فرمایا۔ ان کی کتاب: "سبحان السبوح" بہت مشہور ہے۔ اصل میں یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ دیوبندی اور وہابی حضرات کے جو چند مشہور عقائد ہیں وہ اس وقت سامنے کیوں آئے؟ ان کے عقائد یہ ہیں:

۱. علم غیبِ ذاتی اور عطائی دونوں قسم اللہ کے نبی کے لیے محال ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ)

۲. اللہ تعالیٰ بالفعل کذب بول چکا ہے۔

۳. سرکارِ دوعالم ﷺ کے بعد اگر کوئی نبی آئے تو خاتمیت محمدی میں فرق نہیں پڑے گا۔ (تحذیر الناس)

۴. بندوں کو بعدِ مرگ یا دور سے پکارنا شرک ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ)

بیسویں صدی کے شروع سے عالم اسلام سخت پریشانیوں کا سامنا کر رہا تھا اور اس پر علمی اور سیاسی جنگیں مسلط تھیں۔ ان عقائد جیسے اعتراضات ان پر یورپ کی طرف سے ہو رہے تھے۔ یورپ سے مستشرقین یہ کوشش کر رہے تھے کہ ثابت کر دیں کہ دوسرے نبی کا آنا اسلام میں ممکن ہے اور قرآن میں کذب ہے۔ اور عام امتِ مسلمہ بھی دوسرے شرک کے مذاہب کی طرح شرک میں آلودہ ہے۔ یہ سب مستشرقین عیسائیوں اور یہودیوں کی کوشش تھی اور یہی سب کچھ دیوبندیوں کی زبان پر تھا اور اب تک ہے۔ اسی بات سے اس شبہہ کو تقویت ملتی ہے کہ دیوبندی، وہابی اور قادیانی تحریک اپنے اصلی لباس میں ایک ہیں اور تینوں کی تعلیم کا سرچشمہ یہودی اور کیتھولک تشدد پسند عیسائیوں کی دین ہے، ورنہ وہ وقت ان مسائل کی بحث کا تھا ہی نہیں۔

یہودی یہی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کے دلوں سے محبتِ رسول ﷺ نکال دیں۔ اس کے لیے ان کو تلاش تھی کسی مدعیِ نبوت کی اور چوں کہ قرآن پاک میں سرکارِ دوعالم ﷺ کو خاتم النبیین فرمایا جا چکا تھا۔ اس لیے نئے مدعیِ نبوت کے لانے کے لیے دو ہی راستے تھے، یا تو خدائے تعالیٰ کو جھوٹا کہہ دیا جائے یا آیت کے معنیٰ میں ایسی تاویل کی جائے کہ ــــ (باقی، ص:۲۱ پر)

اہلسنت وجماعت

انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کا تدارک

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

۱۳/محرم الحرام مطابق ۳۱/دسمبر ۲۰۰۹ء کو جامعہ اشرفیہ میں یوم مفتی اعظم ہند کا انعقاد ہوا۔ جشن کا اہتمام حسب روایت جماعتِ سابعہ نے کیا تھا۔ توسیعی خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے آئے ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی نے پیش کیا، موضوع تھا "اہلِ سنت و جماعت: انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کا تدارک" یہ اہم خطاب قارئین کی میز پر بھی پیش ہے۔ امید ہے کہ سنجیدہ اور باشعور طبقہ اسے ضرور پسند کرے گا۔ از: **مبارک حسین مصباحی**

ذی مرتبت سربراہانِ جامعہ، ذی وقار علمائے کرام، عالی مقام اساتذۂ عظام اور طلبۂ عزیز!

الحمد للہ! مرکزِ اہل سنت جامعہ اشرفیہ کی زیارت کرنے، ان سے مستفیض ہونے کی دیرینہ آرزو آج پوری ہوئی ہے۔ خصوصاً اپنے جواں سال اور پرجوش طلبۂ عزیز سے ملنے، ان سے گفتگو کرنے، ان تک ایک پیغام پہنچانے اور ان کے جذبۂ عمل کو مہمیز کرنے کا جذبہ ہی مجھے یہاں لایا ہے۔ خدا کرے کہ میری محنت اور جذبہ ثمر آور ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سعی و عمل کی توفیق عطا فرمائے اور میری بے چینی و بے قراری کو فرحت و انبساط سے شاد کام کرے۔ آپ لوگ دین و مسلک کے پرجوش اور پرعزم مجاہد و مبلغ ثابت ہوں۔ آمین۔

میری صمیم قلب سے گزارش یہ ہے کہ میری عرض داشت کو بغور اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سماعت فرمائیے، اس میں نظر آنے والی تلخی و درشتی پر نہ جائیں، اسے کسی کے خلاف نہ سمجھیں، بلکہ ایک بے چین کی آہ و فریاد سمجھتے ہوئے اس پر غور فرمائیں۔ یقین جانیے جس کا گھر، جس کا اثاثہ لٹ رہا ہو وہ بے قرار ہو کر اِدھر اُدھر بھاگتا ہے، عجیب و غریب آوازیں نکالتا ہے، ایک ایک کو پکارتا ہے، ہر ایک سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ اس وقت وہ الفاظ کے پیچ و خم میں نہیں پڑتا۔ مقفیٰ و مسجع الفاظ نہیں بولتا بلکہ جو خیال اور جو زبان پر آتا ہے وہی کہتا ہے۔

الفاظ کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اس وقت دانائی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ہو، پیغام کی ترسیل ہو جائے اور گوہر مراد حاصل ہو جائے۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتا نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

یہی کیفیت اس وقت میری ہے۔ میں اپنے اہل مسلک کو کم زور و پسپا ہوتے دیکھ کر بکھرتے و سمٹتے دیکھ کر بے چین و بے قرار ہوں، فکر مند ہوں اور اس بے چینی و بے قراری اور فکر مندی کو ہر ایک کے دل و دماغ میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے ہر ایک سے کہتا ہوں کہ بھائی کچھ کرو۔

حضرات! چوں کہ قدیم مراکز اور عمر رسیدہ لوگوں کا جوش و ولولہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ان میں جوش سے زیادہ ہوش کی اور اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کی فکر غالب ہو جاتی ہے، پھر ہمارے سب نہیں لیکن اکثر مراکز پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو اپنے بزرگوں کی کمائی اور وراثت کو کیش کر رہے ہیں اور اس سے عیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بیش تر علم و عمل سے بھی کورے ہیں، حالات سے بے خبر بھی ہیں اور نہ باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ بے حسی اور تن آسانی کا لبادہ اوڑھے ہوئے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے مرغ و بریانی اور نذرانے میں تو کمی آ نہیں رہی ہے، پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ملت و مسلک کے غم میں پڑ کر اپنا آرام و سکون برباد کریں، پریشانیاں اور دشمنیاں مول لیں، اس لیے جو ہو رہا ہے، ہونے دو۔ ایسے لوگوں کے پاس مشیت الٰہی یہی ہے، قربِ قیامت میں یہی ہونا ہے۔ اہل حق کو کم زور ہی ہونا ہے، گم راہی و بے دینی بڑھنی ہی ہے۔ یہ اور ان جیسے جملے اور نسخے بھی موجود ہیں، ان کی آڑ میں وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ اس وقت انھیں اپنے بزرگوں کی وہ محنتیں، لگن اور کوششیں یاد نہیں آتیں کہ انھوں نے کس طرح خلقِ خدا

کو راہِ راست پر لانے کے لیے جد و جہد کی تھی۔ اپنے آرام و سکون کو برباد کر کے دور دراز کے علاقوں اور دشمنوں کے بیچ پہنچ کر اعلاے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کیا تھا۔ اس لیے تو ایسے تن آسان اور نااہل و ناخلف لوگوں کے لیے اقبالؔ نے کہا تھا۔

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

طلبۂ عزیز! آپ نوجوان ہیں۔ آپ کا جامعہ اور یہ مرکزِ اہلِ سنت بھی جدید و جوان ہے۔ جوانوں میں ہی کچھ کر گزرنے، انقلاب لانے اور حالات کو بدلنے کی ہمت و جرأت اور جوش و ولولہ ہوتا ہے۔ کسی بھی تحریک کو عوامی شکل دینے میں نوجوان طبقہ کا سب سے بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ نوجوان قیادت کے اندر کچھ کر گزرنے کا عزم و ولولہ ہوتا ہے۔

ع: اگر ہے جوش و ولولہ تو ڈال دو گے زلزلہ

اسی لیے میں آپ کے پاس یہ فریاد لے کر آیا ہوں کہ کچھ کیجیے، یہی کرنے کا وقت ہے۔ دوسروں کو دیکھیے کہ وہ کس طرح اپنے مسلک و مشن کے فروغ کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں، بھاگے پھر رہے ہیں، دور دراز کے سفر کر رہے ہیں، جان و مال اور وقت کی قربانی دے رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گھیر کر اپنے خیمے میں لا رہے ہیں۔

اٹھو، وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

عزیزانِ گرامی! آپ خوش قسمت ہیں کہ اپنے ہم خیال و ہم عقیدہ لوگوں کے درمیان رہتے ہیں، اسی لیے آپ کو اس فکر اور بے چینی کا احساس کم ہوتا ہے جو ہم جیسوں کو مقدر میں ہے۔ میرے اندر **دراصل** یہ بے چینی اور فکر نہ صرف حالات کو بغور دیکھنے اور مشاہدہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے بلکہ تلخ تجربے سے گزرنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ میرے آبائی شہر امروہہ میں (جسے شہر اولیا کہا جاتا تھا)۔ اب سے ستر اسی سال پہلے تک تقریباً ساری آبادی سنی حنفی تھی اور نوّے فی صد مساجد میں سنی امام ہوتے تھے لیکن ہمارا مدرسہ کچھ ناعاقبت اندیش و نادان دوستوں کے بدولت شکست و ریخت کا شکار ہوا۔ جب مدرسہ ختم ہوا تو مساجد بھی اماموں سے خالی ہو گئیں۔ ادھر ان کا مدرسہ ترقی کرتا رہا، نتیجے میں تمام مساجد میں ان کے امام آ گئے اور آج یہ عالم ہے کہ پورے شہر میں صرف چند مساجد ہی سنیوں کے قبضے میں رہ گئی ہیں۔ مساجد پر قبضے کو وہ لوگ اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں، کیوں کہ مسجد کے ساتھ چند دن میں پورا محلہ ان کے قبضے اور حلقۂ اثر میں آ جاتا ہے۔ اس لیے جوڑ توڑ اور سازشوں کے ذریعہ وہ مساجد پر قبضہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے استاذِ محترم مولانا زاہد سلامی صاحب جانتے ہیں کہ کس طرح میرے پڑوس کی اور میرے زیرِ انتظام مسجد پر قبضہ کیا گیا۔ میں اس کے لیے بیس سال سے زائد عرصہ تک مقدمہ بازی کرتا رہا، کامیاب بھی رہا مگر افرادی قوت مفقود رہی۔ اس کے لیے بااثر سنیوں کو مدد کے لیے پکارتا رہا۔ حضرت سلامی صاحب کے ساتھ بھی اور بارہا علاحدہ بھی سنبھل، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ کے چکر لگاتا رہا۔ جس نے بھی مدد کا وعدہ کیا یا جس سے بھی امید ہوئی اس کے پاس دس دس بار گیا۔ سنبھل کے ایک بڑے حضرت اس وقت کے گورنر کے بہت قریب تھے، انھوں نے بڑے بڑے وعدے کیے، چکر بھی لگوائے مگر کیا کچھ بھی نہیں۔

اہلِ سنت کے افراد کو عموماً وقف بورڈوں، حج کمیٹیوں اور مسلمانوں سے متعلق دیگر امور میں کام کرنے کا موقع کم ہی ملتا ہے اور اگر کسی کو ملتا بھی ہے تو وہ مسلک کے لیے کام کرنے کے بجائے ذاتی منفعت میں لگ جاتے ہیں۔

ایک بزرگ زادے وقف بورڈ کے ممبر ہوئے اور بااثر ممبر ہوئے، لیکن انھوں نے درخواست کے باوجود رُخ بھی نہیں کیا، بلکہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ اور بظاہر کئی اور سچے پکے سنی، اسی نام پر کمانے کھانے والے، اور سنیت کا دم بھرنے والے کئی ممبران پیسہ لے کر اغیار کا کام کر رہے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ ہونے والا مہتمم یا سکریٹری سنی ہے یا غیر۔ انھیں تو بس اپنا نذرانہ چاہیے، اوقاف و درگاہیں کہیں بھی جائیں۔

یہ کسی ایک مسجد، درگاہ یا وقف کا قصہ نہیں ہے، صدہا مساجد و مکابر اور درگاہیں بے حس و بے غیرت گندم نما جو فروشوں کے ہاتھوں سے دستِ اغیار میں گئی ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے تو اقبالؔ نے کہا تھا۔

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

بہر حال یہ ایک طویل داستانِ غم ہے جس سے آپ بھی بڑی حد تک واقف ہیں اور اس صورتِ حال پر اظہارِ افسوس بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن صرف اظہارِ افسوس سے کام نہیں چلے گا۔ آیئے! ہم سب مل کر اہلِ سنت کے انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کے تدارک کے طریقوں پر گفتگو اور غور و فکر کریں۔

اختلاف و انتشار کی نفسیاتی وجوہات:۔

سامعینِ کرام! سب سے پہلے اختلاف و انتشار کی نفسیاتی وجوہات کا جائزہ لیتے ہیں۔

دراصل اختلافِ رائے انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کسی ایک بات پر چند لوگوں کا بھی متفق ہونا مشکل ہوتا ہے، خصوصاً ذہین، تعلیم یافتہ اور صائب الرائے افراد کا متفق الرائے ہونا تو محالات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی و سماجی امور ہوں یا مذہبی افکار و عقائد، نظریاتی ہم آہنگی بہت جلد کافور ہو جاتی ہے اور عقائد و اعمال میں صدہا اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل زمان و مکان سے مبرا ہے، تمدنی زندگی کی ابتدا سے ہو رہا ہے اور انتہا تک ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی مذہب صدہا فرقوں اور مسلکوں میں تقسیم ہونے سے محفوظ نہ رہ سکا۔

اسی کے پیشِ نظر مخبرِ صادق اور بعد از خدا کائنات کی سب سے علیم و خبیر ہستی نے یہ خبر دے دی تھی کہ یہود و نصاریٰ تو ۷۲؍ ۷۲؍ فرقوں میں منقسم ہوئے لیکن میری امت ۷۳؍ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجی ہو گا، باقی سب فکری و عملی گمراہی میں مبتلا ہو کر فی النار ہوں گے۔ غالباً ۷۲؍ اور ۷۳؍ کا عدد بھی محاورۃً اور ایک بڑی تعداد کے اظہار کے لیے ہے، ورنہ اُن فرقوں اور ان کے ذیلی فرقوں اور مسلکوں کا شمار کیا جائے جن کے عقائد و اعمال تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں تو شاید یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو جائے گی۔

آیئے! اب اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ مسلمانوں میں اختلافِ رائے اور فرقہ بندی کی ابتدا کی وجوہات کیا ہیں اور ابتدا کیسے ہوئی۔

مسلمانوں میں اختلافِ رائے اور فرقہ بندی کی وجوہات اور ان کی ابتدا:۔

امتِ مسلمہ میں بڑے اختلاف کی ابتدا رسولِ اکرم فخرِ بنی آدم ﷺ کے وصال اور آپ کی خلافت کے قیام سے ہوئی۔ اس وقت مہاجرین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے حق میں تھے تو انصارِ مدینہ حضرت سعد بن عُبادہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ جب کہ مہاجرین میں سے ہی بنو ہاشم حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی خلافت کے متمنی تھے۔ اس وقت یہ اختلاف صرف فکری و نظریاتی اختلاف تھا، البتہ اس فکری و نظریاتی گمراہی کی بنیاد بنا جو آگے چل کر وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتی چلی گئی اور آج تک برقرار ہے، بلکہ غالباً صبحِ قیامت تک رہے گی۔

شیخین کرام کے دور میں یہ اختلاف معمولی تھا اور دبا رہا لیکن خلافتِ عثمانی کے قیام کے ساتھ ہی باقاعدہ دو گروہ شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان کے نام سے موسوم کیے جانے لگے۔ حالاں کہ ان دونوں بزرگوں میں مکمل اتحاد و یگانگت تھی اور حضرت علی ان کے معین و مددگار تھے۔ یہ حضرات سطحی و گروہی اختلاف سے مبرا تھے۔

عوام سے پیدا ہونے والے اختلاف نے خلافتِ عثمانی کے خلاف درپردہ سازشوں اور پروپیگنڈے کا دور شروع کر دیا، جس نے بالآخر حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کی صورت اختیار کر لی اور نتیجہ ان کی الم ناک شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان ہی حالات میں خلافتِ علی کا قیام ہوا جسے ان شیعانِ عثمان نے ماننے سے انکار کر دیا جن کی قیادت امیر معاویہ کر رہے تھے۔ نتیجہ جنگِ صفین کی صورت میں وقوع پذیر ہوا اور برادر کشی کی تاریخ رقم کی گئی۔ اسی جنگ میں قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کرنے سے نئے اختلافات اور نئے گروہ پیدا ہوئے۔ ایک گروہ جس نے واضح اختلاف کر کے خود کو حضرت علی سے علاحدہ کر لیا، حروریہ اور پھر "خوارج" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ گروہ نہ صرف حضرت علی سے علاحدہ ہوا بلکہ معاذ اللہ خود انھیں کافر قرار دے کر ان سے آمادۂ جنگ ہو گیا۔ بالآخر نہروان کے مقام پر حضرت علی کے ہاتھوں شکست و ریخت اور استیصال کا شکار ہوا۔ اس گروہ کے چند افراد ہی جان بچا کر بھاگ سکے۔

اس وقت مسلمان واضح طور پر تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک وہ جو حضرت علی کی محبت میں غلو کرتا تھا اور خلافت کو انھیں کا حق مان کر خلفاے ثلاثہ کو غاصب کہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ان لوگوں میں شدت آئی اور انھوں نے خلفاے ثلاثہ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام پر سب و شتم اور لعن طعن شروع کر دی۔ اسی وجہ سے انھیں "روافض" کہا گیا۔ یہ عموماً شیعانِ علی اور اب "شیعہ" کہے جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ان کے درجنوں ذیلی فرقے اور مسلک بن گئے۔

دوسرا گروہ خوارج کا تھا جو حضرت علی کے بعض کاموں کی وجہ سے انھیں کافر قرار دے کر ان سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس

طرح مخبر صادق اور صاحبِ علم ماکان ومایکون ﷺ کی وہ پیشن گوئی بھی پوری ہوئی کہ ایک گروہ علی کی محبت میں اور ایک عداوت میں ہلاک ہوگا۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلک اعتدال پر قائم رہا۔ اس نے حضرت علی کی محبت کو جزوِ ایمانی تو سمجھا لیکن دوسرے اصحاب کرام کی قیمت پر نہیں ۔ یہی صحابۂ کرام، اولیاے عظام اور اہلِ حق کا مسلک ہے۔ اسی کے متعلق آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ناجی فرقہ وہ ہوگا جو میری اور میرے اصحاب کی سنت پر عمل پیرا ہوگا۔ الحمدللہ! ہم اہلِ سنت آج بھی اسی مسلکِ اعتدال پر قائم ہیں۔

تمام گم راہ فرقوں کی اصل خوارج ہیں یا روافض:۔

اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب تک جتنے گم راہ و بے دین فرقے پیدا ہوئے ہیں ان کی نظریاتی ہم آہنگی خوارج کے ساتھ ہے یا روافض کے ساتھ اور یہ سب اپنی تعداد اور قوت کے اعتبار سے خواہ کتنے اور کیسے بھی رہے ہوں، کبھی بھی اکثریت میں نہیں رہے۔ اکثریت ہمیشہ مسلکِ اعتدال مسلکِ اہلِ سنت کی ہی رہی ہے۔

مختلف ادوار میں اہلِ سنت کو گم راہ فرقوں سے معرکے در پیش رہے ہیں۔ کبھی ان گم راہ فرقوں کو غلبہ بھی حاصل ہوا ہے اور حکومت کی پشت پناہی بھی۔ اسی کے زور پر وہ غالب اور زبردست بھی نظر آئے ہیں، لیکن اہلِ سنت صدہا نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود مسلمانوں کا سوادِ اعظم ہی رہے ہیں۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت ہمیشہ مسلکِ اعتدال سے ہی وابستہ رہی ہے اور الحمدللہ آج بھی ہے۔ طلبۂ عزیز! اب اصل کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

وہابیت سے در پیش معرکے اور ان کے اثرات و خطرات:۔

گزشتہ دو صدیوں سے اور فی الوقت بھی اہل سنت کو سب سے بڑا اور زبردست معرکہ وہابیت سے در پیش ہے۔ وہابی تحریک نے عالمِ اسلام پر اپنے بڑے گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آج بھی یہ تحریک اپنی پوری شدت و قوت کے ساتھ جاری ہے۔ ممالکِ اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ پر اسی کا تسلط ہے ۔ سعودی عربیہ میں اسی تحریک کے پر جوش حامیوں کی حکومت ہے۔ دوسرے عرب ممالک میں بھی اس کے زبردست حامی و موید موجود ہیں۔ برصغیر میں دیوبندی مکتبِ فکر کی نظریاتی ہم آہنگی اسی تحریک کے ساتھ ہے۔ تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی کے افراد نیز اصلاحی، فلاحی، ندوی وغیرہم تقریباً ان ہی عقائد و نظریات کے حامل ہیں جو وہابی تحریک کے نظریات اور عقائد سمجھے جاتے ہیں۔ خود کو اہلِ حدیث اور سلفی کہنے والے تو وہابیت کے پر جوش حامی اور مبلغ و ترجمان ہیں۔

وہابیت کی یہ تحریک نجد کے اسی علاقے سے شروع ہوئی جہاں سے اسلام کے خلاف پہلا ئر اور پہلی بغاوت مسیلمہ کذاب کی صورت میں ابھری تھی۔ اسی علاقے کے متعلق آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اس علاقے سے فتنے، زلزلے اور قرن الشیطان (شیطان کی سینگ) نکلے گا۔

اس تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی کا خاندان علمی خاندان تھا۔ ان کے والد اور بھائی صحیح العقیدہ عالم تھے اور انھوں نے ان کے افکار و نظریات کی مخالفت بھی کی لیکن ان کی روح میں شروع سے ہی بے چینی و بغاوت تھی۔ انھیں آٹھویں صدی ہجری کے عالم ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم کے افکار و خیالات میں بڑی دل چسپی تھی جو اپنے دور میں تقلید سے بے زار، خروج کی طرف مائل اور شاہ راہِ عام سے ہٹ کر چلنے والے تھے۔ شیخ نجدی نے بھی انھیں کا اتباع کیا۔ انھیں مسلمانوں کے مروجہ افکار و اعمال میں شرک و بدعت نظر آئی۔ خود انھوں نے اور ان کے متبعین نے اس وقت کے مسلمانوں کا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تمام مسلمان اسلام سے یک لخت برگشتہ ہو چکے تھے۔ دوسری جگہوں کا کیا ذکر خود حرمین شریفین میں بت پرستی کے گڑھ اور فسق و فجور کے اڈے قائم ہو گئے تھے۔ خداے واحد کی جگہ بزرگوں اور ان کے مزارات کی پرستش ہونے لگی تھی اور ان سے مرادیں مانگی جانے لگی تھیں۔ وغیرہم۔ **(جاری)**

☆☆☆☆☆

اصلاحِ معاشرہ

پہلی قسط

نظامِ شریعت کے اصلاحی پہلو

مولانا محمد عبد المبین نعمانی قادری

صدر العلما بدر الفضلا، امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی سہسوانی ثم میرٹھی علیہ الرحمۃ والرضوان (متوفی ۲۹ جمادی الآخرہ ۱۳۹۸ھ / ۸ر مئی ۱۹۷۳ء) ۔ علم نحو کے امام تو تھے ہی، حدیث و فقہ اور منطق و فلسفہ میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ نحو اور حدیث آپ کا خاص فن تھا۔ آپ کی کتابیں خالص علمی رنگ لیے ہوئے ہیں، ہر ایک میں آپ تحقیقات کا دریا بہاتے نظر آتے ہیں۔ البتہ آپ کی ایک کتاب "مدنی تاج دار کے لیل و نہار" معروف بہ "نظامِ شریعت" نہایت عام فہم اور عوام الناس کے لیے مفید ترین کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلے قسط وار مضامین کی شکل میں "مدنی تاج دار کے لیل و نہار" کے عنوان سے میرٹھ کے ایک اخبار میں پھر ماہ نامہ "پاسبان" الہ آباد میں چھپتی رہی اور بعد میں "نظامِ شریعت" کے عرفی نام سے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کی زبان نہایت آسان ہے۔ بظاہر پوری کتاب نماز و متعلقاتِ نماز کے مسائل و احکام پر مشتمل ہے لیکن ضمنی طور پر بہت سے دیگر مسائل و فوائد بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسائل و احکام کا موضوع نہایت خشک شمار کیا جاتا ہے۔ عام طور سے لوگ مسائل و نماز کی کتابوں کو پڑھنے میں اکتاہٹ اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ان کتابوں کی زبان بھی بہت شیریں نہیں ہو پاتی کہ مقصد تو بیانِ مسائل ہوتا ہے نہ کہ عبارت آرائی۔ لیکن نظامِ شریعت کتابِ احکام میں اس حیثیت سے نمایاں مقام کی حامل ہے کہ اس میں مسائل نہایت حسین اور دل چسپ پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں، یہی وجہ ہے قاری اسے پڑھتے وقت اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ شروع کرنے کے بعد چاہتا ہے کہ پوری کتاب ختم کرکے ہی دم لے۔

کتاب کا آغاز مختصر پیشِ لفظ سے کیا گیا ہے، پھر سرکارِ دو عالم نورِ مجسم ﷺ کے شب کے معمولات سے اصل کتاب کا آغاز کیا گیا ہے اور اسلامی بھائیوں کو مدنی تاج دار ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی تلقین و تاکید کی گئی ہے۔ پیشِ لفظ کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں اور اس سے کتاب کے اچھوتے اسلوب کا اندازہ لگائیں۔ مصنف تحریر فرماتے ہیں:

"برادرانِ اسلام! انسان کی زندگی دو ہیں۔ ایک دنیوی جو تھوڑے زمانے تک باقی رہ کر ختم ہو جاتی ہے۔ خالقِ عالم نے جتنا زمانہ اس کے لیے مقرر فرمایا ہے، اس سے ایک سکنڈ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی کوئی ایسی طاقت نہیں جو اس میں کمی بیشی کر سکے۔

انسان کی دوسری زندگی اخروی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہے، دنیوی زندگی کی طرح اس کے لیے کوئی حد نہیں کہ وہاں پہنچ کر ختم ہو جائے۔ اس ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کا خیر و خوبی کے ساتھ گزرنا چوں کہ دنیوی زندگی کے کامیاب ہونے پر منحصر ہے، اس لیے ہر عاقل کا فرض ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کو کامیاب بنانے کے واسطے ہر ممکن کوشش عمل میں لائے اور ہر وقت، ہر آن اس کی درستی کی جانب متوجہ رہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دنیوی زندگی کو کس طرح کامیاب بنایا جائے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کا صرف ایک طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر طریقے ہیں سب کے سب درحقیقت زندگی کو خراب کرنے والے ہیں۔ اور وہ ایک طریقہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان کے دو تعلق ہیں، ایک خالق سے، دوسرا مخلوق سے۔ ان دونوں تعلقات کو تازیست اسی طرح قائم رکھے، جس طرح سید الابرار مدنی، تاج دار ﷺ نے قائم رکھا اور ان کے متعلق جو ہدایات فرمائیں ان کو اپنا نصب العین بنائے۔ یعنی اپنی زندگی کو محبوبِ خدا ﷺ کی زندگی کے سانچے میں ڈھال کر آپ کے رنگ میں رنگ جائے۔ اپنے لیل و نہار کو آپ کے لیل و نہار کے ساتھ اس طرح مطابق کر لے کہ عبادت و ریاضت میں، معاشرت و معاملت میں، گفتار و رفتار میں، نشست و برخاست میں، خرد و بزرگ اور احباب کی ملاقات میں، خورد و نوش اور لباس میں، انسانی ضروریات سے فراغت اور جسم کی طہارت میں، بیداری اور خوابِ راحت میں، الغرض جملہ اعمال اور اخلاقیات

میں آپ کے نقشِ قدم کو اپنا پیشوا بنالے، یہاں تک کہ اسی حالت میں دارِ فانی سے ملکِ جاودانی کی طرف رخصت ہو جائے۔"

پھر آگے قوم مسلم کی قومی غیرت وحمیت کو للکارتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"دنیا میں ہر قوم اپنی مذہبی معاشرت اور اپنے پیشوا کے طرزِ عمل کی مضبوطی سے پابند رہتی ہے، بلکہ اپنی معاشرت، اپنا تمدن، اپنے طریقے دوسری اقوام میں رائج کرنے کے لیے ہر قوم نہ صرف مالی ایثار بلکہ جانی قربانی بھی کر گزرتی ہے۔ مگر بڑی شرم کی بات ہے کہ ہم مسلم کہلائیں اور اسلامی معاشرت، اسلامی آداب ترک کرتے جائیں۔ انگریز کو دشمن اسلام سمجھیں، مگر معاشرت میں انگریز کو اپنے اوپر مسلط اس درجہ کر لیا ہے کہ بول چال میں انگریزی انداز مرغوب، کھانے پینے میں انگریزی طریقے محبوب، اٹھنے بیٹھنے میں انگریزی آداب مطلوب۔ یہاں تک کہ شکل وصورت میں انگریز نمودار۔ اولاد کی تعلیم وتربیت میں انگریزی اصول درکار۔ مستورات کے لباس اور زیب وزینت میں میم صاحبہ کے اطوار پسند ہیں۔

آہ! مقامِ غیرت ہے کہ زبان سے خدا اور رسول کی محبت کا دم بھریں اور عمل میں دشمنانِ خدا اور رسول کا ساتھ دیں۔ کیا اہل محبت کا شیوہ یہی ہے؟

اے پیارے بھائیو اور اسلام کے شیدائیو! سنو! اور خوب غور سے سنو! کہ شہنشاہ مدینہ نے اپنی زندگی کے لیل ونہار اس طرح گزارے کہ دنیوی مشاغل اور ضروریاتِ زندگی کو انجام دیتے وقت بھی یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہوئی۔ فقیروں کی صدا یاد رکھو، بھولے مت کا مطلب یہی ہے اور اخروی زندگی کی کامیابی اسی طریقے سے حاصل ہوتی ہے۔ (نظام شریعت از علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ، ص: ۳ تا ۴، مکتبۃ الجیلانی سنبھل)

سونے کی دعا:

-ان مختصر تمہیدی کلمات کے بعد سب سے پہلا عنوان ہے "سونے کا اسلامی طریقہ"۔ اس عنوان کے تحت عام طور سے کتابوں میں وہ دعائیں درج ہوتی ہیں جو سونے کے وقت سرکارِ دوعالم ﷺ سے منقول ہیں۔ یہاں حضرت صدر العلما میرٹھی علیہ الرحمہ نے بھی سونے کے وقت کے ان بعض معمولات و ادعیہ کا ذکر کیا ہے جو احادیث میں مروی ہیں، مگر خاص بات جو آپ کی تصنیف میں ہے وہ یہ ہے کہ احادیث ومعمولات کے ذکر کے بعد اس سے حاصل شدہ فوائد وثمرات اور حکمتیں بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ عامل (عمل کرنے والے) کو عمل کرنے میں مزید رغبت ہو اور اسلامی معاشرت کی خوبیاں بھی اجاگر ہو کر سامنے آتی رہیں۔ چناں چہ سونے سے پہلی پڑھی جانے والی مشہور دعا نقل فرمائی ہے:

بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی. (ترجمہ) — اے اللہ! تیرے ہی نام پاک کی مدد سے سوؤں گا اور تیری ہی مدد سے بیدار ہوں گا۔

یہ ترجمہ حضرت مصنف کا ہے جب کہ ظاہری الفاظ کا ترجمہ یہ ہوگا: "اے اللہ تیرے ہی نام سے میں مرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے زندہ ہوں گا۔" یعنی سونے کو موت اور بے داری کو زندہ ہونے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس دعا کو ذکر کر کے حضرت مصنف علام علیہ الرحمہ نے اس کی حکمتوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"ہمارے لیے اس میں یہ تعلیم ہے کہ بندہ ہر موقع پر معبودِ حقیقی (خدا) کی طرف متوجہ رہے اور اپنے ہر کام کو اس کے زیرِ قدرت اعتقاد کرے۔ نیند بھی اس کے زیرِ قدرت ہے، جب چاہے طاری فرما دے اور جب تک چاہے طاری رکھے۔ چناں چہ انبیاے بنی اسرائیل میں حضرت عُزیر علیہ السلام پر سو سال تک اور اصحاب کہف پر تین سو سال تک بحکم خدا نیند طاری رہی، جس سے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اصحاب واقف ہیں، اور وہ جب چاہتا ہے نیند کو آنے سے روک دیتا ہے۔

روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہم بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلتے رہتے ہیں، چاہتے ہیں کہ نیند آجائے مگر نہیں آتی- کیوں؟ اس لیے کہ وہ نہیں چاہتا، اور جب چاہتا ہے آجاتی ہے۔

نیند بھی ایک قسم کی موت ہے کہ بدن کے تمام اعضا اس کے آنے کے بعد اپنے اپنے کاموں سے معطل ہو جاتے ہیں، اور نیند سے بیدار کرنا حیات سابق کا واپس فرمانا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جو معبودِ حقیقی اس پر قادر ہے، وہ یقیناً مارنے کے بعد جلانے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

پس اس کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد ہر عاقل اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اسلام کا پیش کردہ عقیدہ قطعاً صحیح ہے کہ دنیوی زندگی ختم ہونے کے بعد بنی نوعِ انسان کو پھر زندہ کیا جائے گا تاکہ دنیا میں رہ کر جو اعمال کیے ہیں، ان کی وہاں پر جزا پائیں۔

اور دوسرے مذہب والوں کا یہ کہنا کہ زندگی صرف دنیا ہی کی زندگی ہے، اس کے ختم ہونے کے بعد پھر زندہ ہونا نہیں، یقیناً خلافِ عقل ہے اور اپنے احوال میں غور وفکر نہ کرنے پر مبنی۔" (نظام شریعت، ص: ۴-۵)

اس مختصر سے تحریرِ دل پذیر میں نصیحت وحکمت کے کتنے موتی پنہاں ہیں وہ ہر قاری بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے، مزید یہ کہ اس نیند اور بیداری سے عقیدۂ آخرت پر استدلال کر کے مصنف نے اسلامی عقیدے کی تبلیغ اور مخالفت کی تردید کا بھی فریضہ انجام دے دیا۔

فیضان تسبیحات فاطمہ:

-رات کو سوتے وقت تسبیحاتِ فاطمہ پڑھنے کی حدیث پاک میں تاکید ہے، یوں ہی بعدِ نماز بھی۔ سونے کا اسلامی طریقہ بیان کرتے ہوئے ان تسبیحات کا بھی ذکر کیا ہے، مگر انداز اتنا دل نشین ہے کہ شاید ہی اس کی مثال کہیں اور ملے، پہلے ایک واقعے کے ضمن میں ان تسبیحات کا شانِ ورود بیان کیا ہے، پھر ان سے حاصل ہونے والے فوائد اور اصل واقعے سے مستنبط مسائل و نکات پر بھی بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ پورا مضمون عام فہم ہوتے ہوئے بھی علمی وتحقیقی ہو گیا ہے۔ اصل واقعہ اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد ونکات حضرت امام النحو ہی کی زبانی ملاحظہ کریں اور زبان وبیان کا بھی لطف اٹھائیں۔ مصنف ارقام فرماتے ہیں:

"مرکزِ ہدایت، قاسمِ ولایت، مولاے مشکل کشا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رب العالمین کی نعمتیں تقسیم فرمانے والے آقا ﷺ کی خدمت میں ایک مرتبہ کچھ باندیاں لائی گئیں۔ چکی پیسنے سے مالکِ کونین کی صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاتھوں میں چوں کہ چھالے پڑ گئے تھے، اس لیے میں نے ان سے کہا کہ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر گھر کے کام کاج کے لیے باندی طلب کر لیجیے۔ چناں چہ وہ تین مرتبہ حاضر ہوئیں مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ بعد نمازِ عشا جب حضور مکان میں تشریف لے آئے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کی آمد کا تذکرہ کیا۔ اسی وقت ہمارے یہاں تشریف لائے۔ بعدِ اجازت مکان میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں بستر پر لیٹ چکے تھے۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا، مگر اس شب میں سردی چوں کہ شدید تھی، اس لیے اٹھنے سے روک دیا اور فرمایا جیسے لیٹے ہو ویسے ہی لیٹے رہو۔ پھر اپنی صاحب زادی سے فرمایا: آج ہمارے یہاں کس ضرورت سے جانا ہوا تھا؟ عرض کیا: یارسول اللہ! چکی پیسنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور میرے دونوں ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں، تو میں اس لیے حاضر ہوئی تھی کہ باندی عطا فرما دی جائے۔ ارشاد فرمایا: کیا اس سے بہتر چیز نہ بتائیں؟ عرض کیا: ہاں! ارشاد فرمائیے۔ فرمایا: جب بستر پر لیٹو تو چونتیس (۳۴) بار اللہ اکبر اور تینتیس (۳۳) بار سبحان اللہ اور تینتیس (۳۳) بار الحمد للہ پڑھ لیا کرو۔ جو چیز تم نے طلب کی تھی یہ اس سے بہتر ہے۔" (نظام شریعت، ص: ۵-۶)

اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد حضرت مصنف نظام شریعت اس کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے درس وحکمت کے موتی بکھیرتے ہیں:

ہدایات و فوائد:

-مسلم خواتین خصوصیت کے ساتھ اس واقعے پر غور کریں کہ ان کی دنیوی زندگی کے لیے اس میں بہترین ہدایات ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

1. شوہر کی مالی حالت اگر خادمہ رکھنے کی اجازت نہ دیتی ہو تو بیوی کا فرض ہے کہ گھر کے کام خود انجام دے، شوہر سے بے جا مطالبات نہ کیے جائیں، جب کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عمل کر کے بتایا، سب کام اپنے ہاتھ سے انجام دیے یہاں تک کہ چکی بھی پیسی۔
2. گھر کے کام کرنے سے تکلیف ہوتی ہو، یہاں تک کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ جانے کی بھی نوبت آجائے تو عالی ظرف بیبیاں زبان پر حرفِ شکایت بھی نہیں لاتیں، چہ جائے کہ روٹھ کر کام چھوڑ دیں، جس سے شوہر کو تکلیف پہنچے، بلکہ ایسے وقت کو صبر وسکون سے گزار دیتی ہیں، جیسے کہ سردارِ عرب وعجم ﷺ کی چہیتی صاحب زادی نے عمل کر کے دکھا دیا۔
3. شوہر کا بھی فرض ہے کہ بیوی کی آسائش وراحت کا خیال رکھے اور اس کی تکالیف دور کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرتا رہے۔ جیسا کہ شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمل سے بتایا، باندیوں کے آنے کی اطلاع پا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مشورہ دیا کہ حاضر ہو کر باندی کے لیے درخواست پیش کریں تاکہ تکالیف سے نجات ملے۔
4. موجودہ زمانے میں تعلیم یافتہ خواتین چکی پیسنے کو عیب سمجھتی ہیں۔ ان کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے کہ اگر عیب ہوتا تو شہنشاہِ کونین ﷺ اپنی صاحب زادی کے لیے کس طرح گوارہ فرماتے؟
5. اس واقعے سے یہ سبق بھی ملا کہ جسمانی راحت کے سوال کو کسی مصلحت کے تحت پورا نہ کرتے ہوئے اگر کوئی اچھی بات تعلیم کی جائے تو شانِ ادب یہی ہے کہ اس کو بے چون وچرا تسلیم کر لیں اور اپنے سوال کے پورا کرنے پر اصرار نہ کریں، جیسا کہ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہانے عمل کرکے دکھایا۔(نظامِ شریعت، ص: ۵–۷)

۶. راقم الحروف نعمانی قادری عرض کرتا ہے کہ اس واقعے میں اس بات کا بھی درس ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے دنیاوی منفعت کے مقابل دینی اور اخروی منفعت زیادہ قابلِ توجہ اور لائقِ تسلیم ہے کہ آخرت کا فائدہ ابدی ہے جب کہ دنیاوی فائدہ عارضی ہے۔ افسوس! کہ آج ہمارا مطمحِ نظر یہ بنتا جارہا ہے کہ آخرت کا چاہے نقصان ہوجائے دنیاوی منفعت ہاتھ سے نہ جائے۔

اس تحریر پر تنویر میں کس قدر دل پذیری اور اثر انگیزی کا جوہر پوشیدہ ہے اور اخلاصِ دروں وجذبۂ خیر خواہی کی آنچ کس قدر تیز ہے، ہر ذی عقل قاری محسوس کرسکتا ہے۔

شب بیداری اور خواب:۔ مذکورہ بالا دونوں اوراد کے بعد باوضو سونے کے فضائل کا بیان ہے اور اسی ضمن میں خوف ناک خوابوں کا علاج بھی بتایا گیا ہے، پھر شب میں بیداری کے وقت پڑھنے کی دعائیں رقم فرمائیں اور ان کے فوائد وبرکات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد شبِ قدر کی دعا اور اچھا برا خواب دیکھنے پر کیا کرے، اس کا بیان ہے اور جھوٹے خواب کی مذمت بھی۔ پھر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک خواب شریف کا تذکرہ ہے۔

اس کے بعد سوکر بیدار ہو تو کیا پڑھے، کون سی دعا کرے؟ اس کا بیان ہے جس میں سوکر اٹھنے کے بعد پڑھی جانے والی دعا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ.

(ترجمہ) — سب خوبیاں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے موت (خواب) کے بعد ہمیں حیات (بیداری) عطا فرمائی اور روزِ قیامت اعمال کی جزا کے واسطے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے مُردوں کو زندہ کرکے قبر سے نکالا جائے گا۔

دعا کے ان الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت صدر العلما میرٹھی علیہ الرحمہ نے پانچ نکات وفوائد تحریر فرمائے ہیں اور عجیب عجیب نکتوں کو بیان کرکے اس دعا کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھایا ہے۔ صرف چوتھے نمبر کے ایک فائدے کا خلاصہ ملاحظہ کریں اور دیگر فوائد کو اس پر قیاس کریں اور خدا شوق دے اصل کتاب مطالعہ میں لائیں۔

عربی زبان میں لفظ "نا" جمع کی ضمیر ہے۔ جب متکلم اپنے ساتھ کی حیثیت سے اوروں کو شریک کرنا چاہتا ہے تو اس وقت جمع کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً بندہ مولا تعالیٰ سے دعا کرتا ہے:

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ. ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ یعنی سیدھے راستے کی طلب میں بندے نے اپنے دوسرے دینی بھائیوں کو بھی شریک کرلیا۔ اس واسطے اِھْدِنَا میں ضمیرِ جمع ذکر کی۔ اور اگر کسی حیثیت سے دوسرے کو شریک کرنا مقصود نہ ہوتا تو: اِھْدِنِی الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ. کہا جاتا، جس کا ترجمہ یہ ہوتا: "مجھ کو سیدھا راستہ دکھا"۔

اور کبھی دوسروں کو اپنے ساتھ ثواب میں شریک کرنے کے لیے متکلم جمع کی ضمیر استعمال کرتا ہے، مثلاً مسلم نے کہا: نَحْمَدُ اللّٰہَ تَعَالٰی. "ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں۔" تو چوں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد میں جو کلمہ مسلم کی زبان سے نکلتا ہے اس پر ثواب ملتا ہے۔ اس لیے یہاں پر جمع کی ضمیر استعمال کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ان کلمات کے ثواب میں دوسروں کو شریک کرلیا جائے۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو واحد کی ضمیر لائی جاتی اور اَحْمَدُ اللّٰہَ تَعَالٰی. کہا جاتا اور ترجمہ یہ ہوتا: "میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں"۔ پس نظر بر آں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا کلماتِ شکر جمع کی ضمیر کے ساتھ "اَحْیَانَا" اور "اَمَاتَنَا" فرما کر ان کے ثواب میں اپنے ساتھ اپنی امت کو بھی شریک فرمالیا۔ تو ہمیں اس عملِ نبوی سے یہ تعلیم حاصل ہوئی کہ مسلم کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہے کہ اپنے دینی بھائیوں کی ہم دردی اور خیر خواہی میں فروگزاشت نہ کرے، ان کو ہر ممکن طریقہ سے نفع پہنچانے کی سعی عمل میں لائے۔ حتی کہ کلماتِ حمد وشکر میں بھی ان کو شریک کرلے۔ ایصالِ ثواب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ اس واسطے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بروقت بیعت یہ شرط بھی فرمالیتے کہ بیعت ہونے والا ہر مسلم کی خیر خواہی کرے گا۔

بخاری شریف میں ہے جریر بن عبد اللہ بجلی نے فرمایا کہ میں نے حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں پر اس شرط سے بیعت کی تھی کہ نماز پڑھتا رہوں گا، زکوٰۃ دیتا رہوں گا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرتا رہوں گا۔ چناں چہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیگر شرطوں کے ساتھ تازیست اس شرط کو بھی کامل طور پر پورا فرماتے رہے۔ ایک مرتبہ اپنے غلام کو گھوڑا خریدنے کے واسطے حکم فرمایا۔ غلام نے ایک گھوڑا تین سو روپے میں خریدا اور گھوڑے والے کو ہم راہ لے کر واپس آیا تاکہ اس کی قیمت دلوادی جائے۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے گھوڑے والے سے فرمایا کہ تمہارا گھوڑا تین سو روپے سے زائد قیمت کا ہے، اس کو چار سو میں فروخت کرتے ہو۔ اس نے کہا آپ کو اختیار ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ چار سو روپے سے بھی زائد کا ہے، پانچ سو روپے میں

فروخت کرتے ہو؟ اس نے کہا آپ مختار ہیں۔ آپ قیمت بڑھاتے گئے، وہ راضی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو آٹھ سو میں خرید فرمایا۔

لوگوں نے کہا، آپ نے یہ کیا کیا؟ جب وہ تین سو میں دے چکا تھا پھر قیمت بڑھانے کے کیا معنیٰ؟ آپ نے فرمایا، میں نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر اس شرط سے بیعت کی تھی کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا، تو اس کو پورا کررہا ہوں۔

سبحان اللہ! این کار از تو آید ومرداں چنیں کنند

برادرانِ اسلام! اس واقعے کو پڑھنے یا سننے کے بعد ہر مسلم مرد اور ہر مسلم خاتون کا فرض ہے کہ اپنے اپنے دل کے گوشوں پر گہری نظر ڈال کر معلوم کریں کہ ان میں کسی اپنے مسلمان بھائی کی بدخواہی کا ارادہ یا اس کو ضرر پہنچانے کا خیال تو پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر ہو تو قلب کو اس سے پاک کرلیں اور حضورِ قلب کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں۔

یَارَبَّ مُحَمَّدٍ ! شبِ معراج کے دولھا کا صدقہ۔
یَارَبَّ مُحَمَّدٍ ! کشورِ رسالت کے بادشاہ کا صدقہ۔
یَارَبَّ مُحَمَّدٍ ! سبز گنبد والے آقا کا صدقہ۔

حضرت جریر کی طرح ہمارے دلوں کو بھی مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی کے جذبات سے لبریز فرمادے اور ان کی طرح تازیست اس پر عامل رہنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔" (نظامِ شریعت، ص: ۲۰–۲۲)

آخر میں "وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ" سے عقیدۂ آخرت استدلال فرمایا ہے کہ جو نیند کے بعد بیدار فرمانے پر قادر ہے وہ مرنے کے بعد اٹھانے پر بھی ضرور قادر ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا عقیدۂ بعث ونشر حق ہے اور بالکل عقل وفہم سے قریب۔

سونے کے بعد اٹھ کر پڑھنے کی یہ ایک دعا تھی۔ بظاہر اس کا نقل کرنا ہی کافی تھا، مگر حضرت امام النحو علیہ الرحمہ نے اس کو صرف نقل ہی نہیں فرمایا، اس کے ترجمے کے ساتھ اس کے فوائد ونکات پر ایسی دل نشیں تقریر فرمادی کہ وجدان جھوم جھوم جاتا ہے اور ہر مسلم اپنے کو عمل پر مجبور پاتا ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ سے ایسے ایسے رموز واسرار واشگاف فرمائے کہ ایک مختصر دعا ایک طویل مضمون کا درجہ اختیار کرگئی، پھر اپنے ناصحانہ کلمات سے عمل کی ایسی بجلی بھردی کہ کوئی قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نظامِ شریعت ہی کا حصہ ہے اور پوری کتاب میں اس کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ **(جاری)**

(ص: ۱۲/ کا بقیہ) — دوسرے مدعی نبوت کا دعویٰ صاف ہوجائے۔ اس لیے پہلا کام رشید احمد صاحب نے کردیا اور دوسرا کام قاسم صاحب نے کیا۔ اب رہا تیسرا کام کہ مدعی نبوت کو پیش کردیا جائے تو یہ کام انگریزی حکومت کے سائے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی مدد سے مرزا جی نے کردیا اور خود کو دعوت نبوت پر لا کھڑا کیا۔

نبوت کے تعلق سے ہم بحث اسی باب میں کریں گے اور مرزا و قاسم صاحب کے عقیدے کی تفصیلی وضاحت کریں گے۔ یہاں یہ بات ضمنی طور پر لکھ دی گئی ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہوا کہ عالم کو قدیم کہنے والے اور باری تعالیٰ کے حلول اور کذب اور عیوب سے موصوف ہونے کو ماننے والے کافر ہیں۔ اسی طرح غیر یقینیت اور کائنات کو عبث کہنے والے بھی اسلامی عقیدے میں کافر ہیں، کیوں کہ ان عقیدوں سے اسلامی ضروری عقائد کی نفی ہوتی ہے۔ اسلام میں یقین اور ایمان فرضِ عین ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال کو عبث وبطلان سے پاک ماننا ضروری ہے۔ روح کا انکار بھی کفر ہے، کیوں کہ اس کا وجود بھی قرآنِ پاک سے ثابت ہے۔ اصل میں اہلِ سنت کے عقیدے کی بنیاد بابِ صفات میں یہ ہے کہ جو کچھ صفات قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں، ان کو ثابت ماننا ضروری ہے اور واجب تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت تلاش کرنا انسانی عقل کے دائرہ سے باہر ہے۔ وہاں پر ایمان لازم ہے اور کلی عقیدہ پر ایمان ضروری ہے یعنی ہر کمال سے موصوف اور ہر عیب سے پاک۔

واجب تعالیٰ کے تعلق سے معتزلہ کا ایک اور عقیدہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کے لیے وہی کرنا واجب ہے جو مخلوق کے لیے زیادہ بہتر ہو۔ موجودہ دور میں کچھ اسلامی فرقے بعینہٖ تو اس عقیدے کو نہیں دہراتے مگر ان کے علمی دلائل سے اس کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً وہ فرقے ان تمام احکام کو رد کردیتے ہیں جو ظاہر میں انسانوں پر گراں گزرتے ہوں، مثلاً طلاق اور بیوع میں شرعی پابندیاں۔ اور کچھ حدود یعنی اسلامی سزاؤں کا انکار کرتے ہیں۔ تو ظاہر یہ ہے کہ یہ لوگ ان معتزلہ کی طرح سوچ رکھتے ہیں جو واجب تعالیٰ پر اصلح کام کو واجب سمجھتے تھے، کیوں کہ یہ لوگ بھی انھی احکام کو قبول کرتے ہیں جن کو ان کی عقل اصلح کہہ دے۔

باقی حسن وقبح عقلی کا بیان ہم شرعی دائرہ کے باب میں کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ **(جاری)**

انسدادِ جرائم کا اسلامی نقطۂ نظر

محمد عابد چشتی

زناکاری کے بڑھتے واقعات، چوری کی کثرت سے پیش آتی واردات اور ایک دوسرے کی کردارکشی نے انسانوں کے درمیان اضطراب اور بے چینی کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ لوگ ایسے نظامِ عدل کے خواہاں ہیں جس کے سبب دنیا میں امن و شانتی کا ماحول پیدا ہو جائے، جرائم و مظالم کا دروازہ بالکلیہ بند ہو جائے، چاروں طرف لوگ بے خوف ہو جائیں اور امن و امان کی فضا قائم ہو جائے۔ لیکن یہ حسین خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو گا جب دنیا میں اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جائے گا۔ مگر ہو سکتا ہے کسی کی سطحِ ذہن پر یہ سوال ابھر رہا ہو کہ اگر مذہب ہی کے قوانین کا نفاذ کرنا ہے تو پھر اسلامی قوانین ہی کیوں؟ اس لیے کہ کوئی بھی دین اور مذہب ہو، خواہ عیسائیت ہو یا یہودیت، ہر مذہب زناکاری، چوری اور تہمت بازی وغیرہ جرائم سے منع کرتا ہے، انھیں قبیح جانتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو سختی کے ساتھ ان سے روکتا ہے تو پھر اسلام اور دیگر مذاہب میں فرق کیا ہے؟ جب کہ جو مقاصد و اہداف اسلام کے ہیں وہی دیگر مذاہب کے بھی ہیں یعنی امن و شانتی۔ ہم ذیل کی سطور میں یہ واضح کریں گے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے اصول و قوانین میں خطِ فاصل کیا ہے؟ جو اسلام کو تمام ادیان پر فوقیت دیتا ہے اور ساری دنیا کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیں۔ آخر خدائے تعالیٰ نے پسندیدہ دین کا تاج اسلام ہی کے سر کیوں رکھا؟؟

مختلف ادیان و مذاہب کی معاشرتی تعلیمات قدرے اختلاف کے ساتھ مشترک نظر آتی ہیں مگر اسلام کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ہے اس کے جرائم کے سدِباب کے طریقے اور ایک پر امن معاشرے کا قیام جس کا رنگ دیگر مذاہب میں نہیں ملتا۔

کسی بھی جرم کو روکنے کے لیے دو چیزوں پر توجہ دینا ضروری ہے:

۱. اسباب و محرکات پر پابندی۔
۲. مرتکب پر سزا کا نفاذ۔

جب تک ان دونوں پہلوؤں پر کما حقہ عمل نہیں ہو گا، کسی بھی جرم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک پہلو پر نظر رکھنا اور دوسرے پہلو سے صرفِ نظر کر دینا انسدادِ جرم کے لیے قطعاً مؤثر نہیں ہو گا۔ آج برِصغیر نہیں بلکہ پوری دنیا میں جرائم کی جو کثرت ہو رہی ہے وہ اسی خامی کا نتیجہ ہے کہ دیگر مذاہب کے مفکرین ملزم پر سزا کا نفاذ تو بڑی سختی سے کرتے ہیں مگر اسباب و محرکات پر پابندی عائد نہیں کرتے۔ مگر اسلام مرتکبِ گناہ پر سزا کا نفاذ بعد میں کرتا ہے پہلے اس کے اسباب و محرکات پر سختی سے پابندی عائد کرتا ہے، اس لیے کہ یہی ان جرائم کا سرچشمہ اور بنیاد ہوتے ہیں۔ مثلاً:

زناکاری:- بہت ہی قبیح اور شنیع فعل ہے۔ اس کی قباحت کے جراثیم سے جہاں ایک طرف پاک دامن اور عفت مآب خواتین کی پاک دامنی پر بدنما داغ لگ جاتا ہے وہیں دوسری طرف اس کے لیے معاشرے میں سر اٹھا کر جینا دوبھر ہو جاتا ہے اور اس کی شادی میں شدید رکاوٹ کا باعث بن جاتا ہے جس سے اس کی زندگی جہنم سے بدتر ہو جاتی ہے۔ تمام مذاہب کے بانیوں نے اس کی سخت مذمت کی اور زانی کے لیے طرح طرح کی سزائیں تجویز کیں مثلاً کسی نے قتل کی سزا رکھی، کسی نے سوشل بائیکاٹ کی، کسی نے عضوِ مخصوص کاٹنے کا فیصلہ سنایا تو کسی نے سیاہی پوت کر گدھے پر گشت کرانے کی تجویز پیش کی۔ مگر چوں کہ یہ ایک پہلو (ملزم پر سزا کا نفاذ) پر عمل تھا اور دوسرے پہلو پر عمل نہ ہوا لہٰذا جرم بڑھتا گیا۔ زناکاری کے واقعات میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ اسی لیے اللہ کی بے آواز لاٹھی بن کر "ایڈز" نے اپنے پاؤں ساری دنیا میں پھیلا دیے۔

اب آئیے مذہبِ اسلام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مذہبِ اسلام بھی زنا کی سخت مذمت کرتا ہے۔ مگر دیگر مذاہب کی طرح اس کے سدِباب کے لیے صرف مجرم پر سزا کے نفاذ اور اسباب و محرکات سے یکسر صرفِ نظر کا حامل نہیں بلکہ وہ پہلے یہ دیکھتا ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب تھے جن کے سبب انسان اس فعل پر آمادہ ہوا۔ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کے سبب وہ اس جرم کا مرتکب ٹھہرا۔ لہٰذا

اسلام نے اس کے اصل محرک یعنی عورتوں کو کھلے عام اپنے جسم کی نمائش پر پابندی عائد کی، کیوں کہ انسان کا نفس عورتوں اور جوان دوشیزاؤں کے بدن کو دیکھ کر بھڑکتا ہے، انھیں دیکھ کر اس کی شہوت جاگتی ہے۔ تو سب سے پہلے اسلام نے ان اسباب پر پہرا بٹھاتے ہوئے یہ حکم صادر فرمایا: "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" اور: "ولا يبدين زينتهن" کہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور بے پردہ نہ ہو جیسے اگلی جاہلیت کی بے پردگی اور اپنا بناؤ سنگار دوسروں پر ظاہر نہ کرو۔

لہٰذا مردوں کے دل میں جس سبب سے ہیجان پیدا ہوتا ہے اس پر پابندی عائد کر دی۔ جب سبب شہوت ہی نہیں پایا جائے گا تو مسبب یعنی زنا کے واقعات بھی رونما نہیں ہوں گے۔ جس طرح شراب کے لیے تڑپتے ہوئے شرابی کے ہاتھ میں جام دے کر اسے پینے سے منع کرنا عقل مندی نہیں ہے اسی طرح عورتوں کو چست اور تنگ لباس پہنا کر نیم عریاں کر کے مردوں سے اختلاط کا موقع فراہم کرنا اور پھر مردوں پر یہ پابندی لگانا کہ انھیں شہوت کی نگاہ سے نہ دیکھیں سمجھ میں آنے والا فلسفہ نہیں ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے عورتوں کو اسلام نے پردے کا واجبی حکم دیا۔

اس کے بعد اب جرم کے دوسرے پہلو "ملزم پر سزا کا نفاذ" کے لیے عملی اقدامات کیے کہ ان پابندیوں کے باوجود اگر کوئی خبیث نفس چند لمحوں کی لذت کی خاطر کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے تو اسلام نے اس کے لیے وہ عبرت انگیز سزا تجویز کی کہ جسے دیکھ کر اچھے اچھے شہوت پرست اور ہوس کے پجاریوں کا پتہ پانی اور نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ یعنی "رجم" کھلے میدان میں تمام لوگوں کے سامنے پتھروں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دینا، یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی روح یہ منظر دیکھ کر کانپ جاتی ہے اور نہ جانے کتنے وہ لوگ جن کے دل میں اس فعل کا ارادہ تھا اپنی آنکھوں سے انجام دیکھ کر باز آ جاتے ہیں۔ اسلام کی یہی وہ خوبی ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔

چوری:- بھی ان افعال میں سے ہے جسے تمام مذاہب میں جرم تصور کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو اپنے بچوں کی پرورش اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے مال و اسباب جمع کرے اور کوئی شخص اس کے مال کو شاطرانہ چال سے اچک لے تو یقیناً قابلِ مذمت فعل ہو گا، جس کے سبب ایک طرف وہ اپنی محنت و مشقت سے کمائے ہوئے مال سے ہاتھ دھو بیٹھے گا، وہیں دوسری طرف مالی دیوالیہ پن کا شکار ہو کر قرض کے بوجھ میں دب کر رہ جائے گا اور پھر اس معاملہ کی نوبت خودکشی تک پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا ہر مذہب نے مال کی حفاظت و صیانت کے لیے چور پر مختلف قسم کی سزائیں اور عقوبات نافذ کیے، مثلاً دو مہینہ بامشقت قید، سماج سے بائیکاٹ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چوں کہ یہ جرم کے سدِباب کے ایک پہلو پر عمل تھا اور دوسرا پہلو "اسباب و محرکات کے انسداد" سے صرفِ نظر کیا گیا تھا۔ اس پر غور نہیں کیا گیا کہ چوری کے یہ واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے چوری اور ڈاکہ زنی کے واقعات میں کمی ہونے کے بجائے اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

اب آئیے مذہبِ اسلام کا دستور بھی ملاحظہ فرمائیے کہ اس نے مال کی حفاظت و صیانت کا کتنا پیارا انتظام کیا!

ہم مذکورہ بالا سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلام پہلے جرم کے اسباب و محرکات پر غور کرتا ہے تاکہ جرم کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔ تو جب اسلام نے دیکھا کہ ایک سیدھا سادہ انسان جب کہ وہ جانتا ہے کہ پکڑے جانے پر وہ کڑی سزا کا مستحق ہو گا، اس کے باوجود چوری کیوں کرتا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو پتہ چلا کہ انسان کو اس فعل پر آمادہ کرنے والی چیز غربت اور افلاس ہے کہ جب اس کے بچے بھوک و پیاس سے بلک رہے ہوں، یا کسی مرض میں مبتلا ہوں اور اس کے پاس اسبابِ رزق کی قلت ہو تو جلدی مال حاصل کرنے کی اسے جو ترکیب سمجھ میں آتی ہے وہ ہے "چوری" اور پھر ایک سلیم الفطرت انسان چوری کے جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پہلے اسلام نے ان اسباب کا سدِباب کرتے ہوئے اغنیا اور اہلِ ثروت حضرات کو حکم دیا: "وآتوا الزكوٰة۔" کہ وہ اپنے مال سے غریبوں، یتیموں اور پریشان حال لوگوں کو زکوٰۃ دیں تاکہ وہ کوئی چھوٹا روزگار تلاش کر کے دو وقت کی روٹی کھا لیں اور چوری جیسے فعلِ شنیع سے باز رہیں۔ جب اس پہلو پر مکمل طور پر عمل ہو جائے گا تو اسلام دوسرے پہلو یعنی نفاذِ سزا پر عمل کرتا ہے کہ اس کے باوجود اگر کوئی صرف مفت مال حاصل کرنے کی غرض سے کسی کی محنت و مشقت سے کمائے ہوئے مال پر ہاتھ صاف کرتا ہے تو پھر اسلام نے اس کے لیے بڑی پر حکمت اور روح فرسا سزا تجویز کی۔ یعنی "قطع ید" تمام لوگوں کے —

(باقی، ص: ۵۶ ر پر)

حضرت سید نورانی بابا گجراتی

محمد نظام الدین مصباحی

صوبہ گجرات کا قصبہ پٹلاد تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ یہاں مختلف ادوار میں قد آور علما اور صوفیا موجود رہے ہیں۔ مثلاً ساتویں صدی میں قدوۃ الاولیا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رضی اللہ تعالی عنہ کے مرید و خلیفہ شیخ المشائخ حضرت ارجمند شاہ قدس سرہ فرغانہ سے پیر و مرشد کے حکم پر قصبہ پٹلاد تشریف لائے اور دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی اور یہی زمین آپ کا مدفن بنی۔ نیز گیارہویں صدی میں اس سرزمین پر عظیم محقق و محدث اور بے نظیر متکلم حضرت احمد بن محمد الفاروقی جلوہ گر ہوئے۔ آپ استاذ الہند حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علوی قدس سرہ کے برادر کے نواسے ہیں۔ آپکی کتاب "زاد الاحباب فی مناقب الاصحاب" حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالی عنھم اجمعین کی فضیلت پر ایک دائرۃ المعارف ہے۔

پیر طریقت حضرت سید نورانی بابا قدس سرہ ۱۹۲۸ میں سادات گھرانے میں اس عظیم سرزمین پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حضرت سید حیدر علی اور دادا کا نام حضرت سید امیر علی ہے (رضی اللہ تعالی عنھما)۔ آپ نے دینی و روحانی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور روحانیت میں مزید ترقی حاصل کرنے کے لئے آپ نے محدث دکن حضرت مخدوم ماہمی قدس سرہ [المتوفی ۸۳۵ھ] کے مزار پر انوار (واقع بمبئی) پر مجاہدات اور روحانی اشغال میں کئی ایام گزارے اور حضرت مخدوم قدس سرہ کی توجہ روحانی سے حضرت نورانی بابا قدس سرہ کا سینہ علوم و معارف سے منور و روشن ہو گیا۔

آپ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز گجرات کی سرزمین سے کیا۔ بھڑوچ بڑودہ وغیرہ اضلاع کے گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ جا کر لوگوں کو عقائد اہل سنت سے واقف کراتے اور باطل فرقوں کی بدعقیدگی ان کی کتابوں سے بتا کر لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تلقین و تاکید فرماتے۔ دھیرے دھیرے لوگوں میں آپ کی مقبولیت بڑھنے لگی اور لوگ آپ کے سلسلہ میں داخل ہونے لگے۔ آپ نے گجرات سے جہالت کا خاتمہ کرنے کی جد و جہد فرمائی۔ آپ مریدین کو یہ نصیحت فرماتے کہ اپنے بچوں کو عالم بناؤ، کئی بچوں کو آپ بنفس نفیس یو. پی. کی سرزمین پر اعلی تعلیم دلانے کے لیے لے کر گئے تا کہ یہ بچے پڑھ کر دین کی خدمت کریں۔ آپ خود بھی علما سے محبت کرتے، ان کو نوازتے اور مریدین کو بھی علما کا ادب و احترام اور خدمت کرنے کا درس دیتے، چناں چہ آج بھی آپ کے مریدین علما سے خوب محبت کرتے ہیں۔

آپ ۱۹۷۲ میں پہلی بار برطانیہ تشریف لائے۔ اس دور میں برطانیہ میں علمائے اہل سنت اور مشائخ خال خال تھے۔ آپ کے ایک مرید الحاج محمد بھائی تھام والے (بلیک برن) بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے برطانیہ میں میرے بھائی الحاج عبد اللہ پٹیل کے یہاں قیام فرمایا اور حضرت انڈیا سے اپنے چند کپڑوں کے علاوہ اپنے لیے کچھ بھی نہ لائے، ہاں اہل سنت و جماعت کو مضبوط کرنے کے لئے کافی مقدار میں کتابیں اور شیخ الاسلام حضرت علامہ سید مدنی میاں وغیرہ کی تقاریر کی ریکارڈنگ لائے۔ جب لوگ آپ سے ملنے آتے تو اپنے خاندان کا تعارف کرانے کے بجائے یا تو کتاب سے کچھ نہ کچھ دینی بات سناتے یا پھر اس دور کے مخصوص آلہ کے ذریعہ ریکارڈ شدہ تقریر سناتے۔ آپ کی ان کوششوں سے آہستہ آہستہ لوگوں میں دینی اور مسلکی بیداری پیدا ہونے لگی۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ اگر عقائد کی پختگی اور دلائل کی روشنی چاہتے ہو تو علمائے اہل سنت کو بالخصوص حضرت علامہ سید مدنی میاں مدظلہ العالی کو بلاؤ چناں چہ آپ کی تحریک پر حضرت علامہ سید مدنی میاں مدظلہ العالی برطانیہ آنے لگے۔ اور بقول مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی، ابتدائی دور میں علامہ سید مدنی میاں کی تقریروں نے عقائد میں پختگی پیدا کی۔

حضرت سید نورانی بابا قدس سرہ نے برطانیہ بھر میں سنیت کو مضبوط کرنے کے لیے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے مریدین برطانیہ، بلجیم، ہالینڈ اور افریقہ وغیرہ ممالک میں کثیر تعداد میں ہیں۔

آپ کے مریدین میں علما، حفاظ اور قرا کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ آپ کے ایک مرید خاص حضرت مولانا حسن آدم علیہ الرحمہ جو برطانیہ میں لنکاسٹر میں رہتے تھے اور وہیں مدفون ہیں۔ انہوں نے کنز الایمان مع تفسیر خزائن العرفان، سنی دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ، تمہید ایمان اور انوار البشارۃ کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور دوسرے مرید حافظ موسی صاحب جو پریسٹن میں قیام فرما ہیں درجنوں کی تعداد میں حفاظ فارغ کر چکے ہیں اور آپ قانون شریعت حصہ اول اور مسئلۂ تکفیر اور امام احمد رضا گجراتی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

حضرت سید نورانی بابا قدس سرہ ایک سچے عاشق رسول تھے؛ نعت و تقریر کی سماعت کے دوران آپ کی آنکھیں نم ہو جایا کرتیں۔ آپ کو سنیت سے اتنا لگاؤ تھا کہ حضرت علامہ سید مدنی میاں نے ایک بار لنکاسٹر کی سرزمین پر ارشاد فرمایا کہ اگر بابا سے کہا جائے کہ سنیت کے لئے جان دے دو تو آپ جان کا نذرانہ بھی پیش فرما دیں (بروایت حضرت مولانا محمد اقبال مصباحی)۔

آپ نے تقریباً تیرہ مرتبہ حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ آپ کی مکہ شریف میں کیا کیفیات ہوتیں؟ اس کو آپ کے مرید خاص الحاج موسی بھائی ناتھا (بلیک برن) بیان کرتے ہیں کہ آپ مکہ شریف میں مریدین سے فرماتے: یہ مکہ شریف ہے یہاں اپنے آپ کو ایک دیوانہ کی طرح رکھو اور آپ خود بھی ایک دیوانہ کی طرح رہتے اور کعبہ شریف پر اپنے معبود حقیقی کے جلووں کی پڑنے والی کرنوں کی دید میں مگن رہتے۔ اور مدینہ طیبہ میں ایک عاشق زار کی طرح رہتے اور اپنے آقا اور نانا جان ﷺ کی بارگاہ میں سراپا ادب بن جاتے۔

آپ کو خصوصی طور پر سیدنا غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالی عنہ سے لگاؤ تھا اس لیے اکثر یہ دعا فرماتے: اے اللہ عز و جل! میرا حشر قادری گروہ میں فرما۔ آپ نہایت صابر، قانع، بردبار، مخلص اور عجز و انکساری کا پیکر تھے۔ آپ نے سیادت کو ہمیشہ اللہ عز و جل کا انعام سمجھا اس لئے غرور، انانیت، حب جاہ و مدح نے آپ کے در کا رخ بھی نہ کیا۔

آپ نے ہمیشہ بے لوث دین کی خدمت کی۔ آپ خود بھی اپنی جیب خاص سے دینی کاموں میں حصہ لیتے اور مریدین کو بھی ترغیب دلاتے کہ اگر کسی عالم کو کوئی کتاب چھاپنے کی ضرورت پڑتی تو آپ اس کی اشاعت میں بڑھ کر حصہ لیتے۔ مثلاً استقامت ڈائجسٹ انگریزی زبان میں اشاعت کے لیے آپ نے اس کے مدیر کو اس زمانے میں £500 (۵۰۰ پاؤنڈ) عنایت فرمائے۔

آپ کی ایک عظیم خدمت یہ بھی ہے کہ جب برطانیہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے مابین سنی دعوت اسلامی، حضرت مولانا محمد یونس مصباحی کے ذریعہ متعارف ہوئی اور حضرت امیر سنی دعوت اسلامی کے دورے شروع ہوئے تو بعض مسائل کی وجہ سے حضرت امیر کو کچھ لوگوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ایسے نازک حالات میں حضرت بابا نے سنی دعوت اسلامی کو سہارا دیا، اور آج برطانیہ کے ہندوستانی مسلمانوں میں جو سنی دعوت اسلامی کی ہمدردیاں نظر آتی ہیں یہ دراصل حضرت بابا علیہ الرحمہ کی نگاہ کرم ہے۔

آپ کو امام احمد رضا رضی اللہ تعالی عنہ سے قلبی لگاؤ تھا لہٰذا جس تنظیم کو دیکھتے کہ یہ اعلیٰ حضرت کی فکر کے مطابق ہے اس کا ساتھ ضرور دیتے اور ذرا بھی کوئی فکرِ امام سے منحرف ہوتا تو اس سے علیحدگی اختیار فرماتے۔ آپ نے اپنی زندگی میں اپنے نام سے کوئی ادارہ قائم نہیں فرمایا؛ آپ اہل سنت کے ہر ادارہ کو اپنا ادارہ تصور کرتے۔

آج بلیک برن اور پریسٹن میں دو ادارے آپ کے نام سے منسوب ہو کر کام کر رہے ہیں۔ وصال کے بعد کسی کے نام ادارہ کا انتساب اس شخصیت کی مقبولیت کی دلیل ہے، لہٰذا ان اداروں کا آپ کے نام سے انتساب آپ کے خلوص و مقبولیت کو ظاہر کر رہا ہے۔

آپ کا وصال جس سال ہوا اسی سال رمضان شریف میں مع اہل و عیال عمرہ شریف و زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے مریدین میں مرحوم الحاج یونس مالجی (مدفون مکہ شریف) اور الحاج موسی ناتھا تھے۔ عمرہ و زیارت کے بعد ہندوستان وطن جا کر ۲۱ شوال ۱۴۲۱ھ میں وصال فرما گئے۔ ہزاروں لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی آپ کی نماز جنازہ حضرت علامہ سید مدنی میاں مدظلہ العالی نے پڑھائی۔

اللہ رب العزت آپ کے مرقد انور پر تا قیام قیامت انوار و برکات کی بارش فرمائے اور آپ کا فیض عام و تام فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الکریم علیہ افضل الصلاۃ و اکمل التسلیم

☆☆☆☆☆☆

گلوبلائزیشن

تعارف-اہداف-اثرات

محمد ساجد رضا مصباحی

مذہب اسلام نے اپنی گونا گوں خصوصیات اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگی کے سبب تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کے نقشے میں ایک مقبول ترین مذہب کی حیثیت حاصل کرلی، چودہ سو سال کے طویل سفر میں ہر دور اور ہر زمانے میں اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے۔ آج بھی مادیت سے بے زار قومیں روحانی اطمینان و سکون کے لیے اسلام کے دامن میں پناہ لے رہی ہیں اور اسلام کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، لیکن برا ہو دنیا کی ذلیل ترین قوم یہودیوں کا جنھیں اسلام کی اشاعت و مقبولیت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انھوں نے روز اول ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش اور پروپیگنڈے کو اپنا نصب العین بنایا اور اسلام کے ابتدائی زمانے ہی سے اس کی روز افزوں مقبولیت سے خوف زدہ ہو کر طرح طرح کی سازشیں رچنا شروع کردیں۔ عہد عباسیہ اور مابعد کی صلیبی جنگیں اسی مہم کا حصہ تھیں۔ ان جنگوں میں مجاہدین اسلام کی پیہم کوششوں اور مخلصانہ قربانیوں سے یہودیوں کو جس ذلت و رسوائی اور شرم ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا، وہ تاریخ کا حصہ ہیں لیکن یہودی قوم کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شکست و ریخت اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود مایوس نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے عزم و استقلال میں کوئی فرق آتا ہے۔ صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد یہودیوں نے طریقہ جنگ میں تبدیلی کی اور ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا۔ یہودیوں کا یہ نیا نظام تحریک استشراق کے نام سے متعارف ہوا۔ اس تحریک نے اسلامی علوم و فنون پر تحقیق و ریسرچ کے نام پر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بے شمار غیر انسانی اور غیر اخلاقی حرکات منسوب کیں۔ اسلامی علوم و فنون میں طرح طرح سے خرد برد کرنے کی کوششیں کیں۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بے شمار ایسے واقعات کا اضافہ کیا جن کا ماخذ یہودی دانش وروں کے عیارانہ و شاطرانہ ذہن و دماغ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن علماے امت نے اپنی حکمت عملی، فکر و تدبر اور دلائل و براہین کی روشنی میں ان کی ہرزہ سرائیوں کا دندان شکن جواب دے کر ان کی اس تحریک کو بھی پوری طرح ناکام بنا دیا۔ تحریکِ استشراق کی ناکامی کے بعد یہودی رہ نماؤں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک نئی سازش رچی اور "نئی بوتل میں پرانی شراب" کے مصداق یہودیوں کی قدیم ترین تحریک کو "گلوبلائزیشن" کے نام سے میدانِ عمل میں اتارا۔

۱۹۷۳ء میں فرانس کے شہر پیرس میں مستشرقین کی انیسویں عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں امریکہ کے مشہور مستشرق برناڈ لوئس نے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اب ہمیں مستشرق کی اصطلاح کو تاریخ کے حوالے کردینا چاہیے۔" برناڈ لوئس کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے شرکا نے اتفاقِ رائے سے "گلوبلائزیشن" کی اصطلاح وضع کی۔ اس تحریک کی قیادت امریکہ کے سپرد کی گئی۔ تحریکِ استشراق کی اصطلاح میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے طرزِ عمل اور دائرہ کار میں بھی تجدید کاری ہوئی۔ تحریکِ استشراق کا میدانِ کار مذہب تھا، وہ بھی صرف اور صرف مذہب اسلام، جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے غلط فہمیاں پھیلانا اور اسلامی احکام و قوانین کی غلط تعبیر و تشریح کرکے اقوامِ عالم کو اس سے بیزار کرنا تھا۔ اس کی ساری سرگرمیاں اسلام ہی سے متعلق تھیں لیکن گلوبلائزیشن کے دائرۂ عمل میں مذہب اور اس کے متعلقات کے ساتھ ساتھ اقتصاد، سیاست اور تہذیب و ثقافت کو بھی شامل کیا گیا۔[۱]

گلوبلائزیشن کیا ہے؟: گلوبلائزیشن لفظ کا استعمال سب سے پہلے امریکہ میں ہوا، جس کا معنیٰ "عالم گیریت" ہے۔ عربی زبان میں اس کی تعبیر: "العولمة، الكونية، الكوكبة" جیسے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ ویبسٹر (Webester) کی نیو کالج ڈکشنری میں گلوبلائزیشن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"کسی چیز کو عالمیت کا جامہ پہنانا یا کسی چیز کے دائرہ کو عالمی بنانا۔"[۲]

گلوبلائزیشن کا مقصد: مغربی مفکرین نے گلوبلائزیشن کی جو نوع بنوع تعریفیں کی ہیں ان کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ گلابلائزیشن کا مقصد مختلف شعبہ ہاے حیات کی عالم کاری اور ان کی مقامی و جغرافیائی حیثیت کو ختم کرنا ہے۔ مثلاً اقتصادیات کے باب میں گلوبلائزیشن کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کوئی بھی انسان دنیا کے کسی بھی خطے میں صنعت و تجارت کے ذریعہ مالی منفعت حاصل کرسکتا ہے۔ ملکی و جغرافیائی حدود اس عمل میں اس کے لیے کسی بھی طرح رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ سیاست کی دنیا میں گلوبلائزیشن کا مطلب یہ ہے کہ مقامی و ملکی حکومتوں کو ختم کرکے ایک ایسی عالمی حکومت وجود میں لائی جائے جس کا تابع فرمان پوری دنیا ہو اور اس عالمی حکومت کا اثر پوری دنیا پر مرتب ہو سکے۔ تہذیب و ثقافت کے میدان میں گلوبلائزیشن کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی تہذیب و ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کرکے علاقائی، ملکی اور مذہبی امتیازات کو جڑ سے ختم کردیا جائے اور دنیا کی پوری انسانی آبادی کو وحدت و یکسانیت کی لڑی میں اس طرح پرو دیا جائے کہ ان کے سارے تشخصات و امتیازات کالعدم ہو جائیں۔

مغربی مفکرین کے ذریعہ کی گئی تعریفات سے گلوبلائزیشن کے جو مقاصد سامنے آتے ہیں وہ کس درجہ خطرناک ہیں، اربابِ فکر و نظر پر مخفی نہیں۔ یہودیت کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی اہلِ مغرب کی نیت کا کھوٹ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے مقاصد پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو سطحِ ذہن پر درجنوں سوالات ابھرتے ہیں، مثلاً اہل مغرب جس عالمی حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں اس کی قیادت کس کے ہاتھ ہوگی، جس تہذیب و ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کی بات کی جارہی ہے وہ کس قوم اور مذہب کی تہذیب و ثقافت ہوگی اور کن بنیادوں پر اس کو پوری دنیا کے لیے لائق تقلید قرار دیا جائے گا؟ اقتصادیات کی عالم گیریت کے مفادات کس کے حق میں ہوں گے؟ گلوبلائزیشن کا نفاذ اقوامِ عالم کی باہمی رضامندی اور صلاح و مشورے سے ہوگا یا ان کا فکری استحصال کرکے غیر شعوری طور پر انھیں گلوبلائزیشن کا حامی بنا دیا جائے گا

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات سے مغربی مفکرین گریز کر رہے ہیں اور گلوبلائزیشن کی تفصیلات کو سربستہ راز بنائے ہوئے ہیں، لیکن عالم اسلام کے اہل فکر و نظر گلوبلائزیشن کی آڑ میں ان کے شاطرانہ اور عیارانہ مقاصد کو بخوبی سمجھ رہے ہیں۔ معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر مصطفیٰ محمود کہتے ہیں:

"گلوبلائزیشن ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد مختلف اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی نظاموں، رسوم و رواج اور دینی، قومی اور وطنی امتیازات کو ختم کرکے پوری دنیا پر امریکی نظام کے مطابق جدید سرمایہ دارانہ نظام کے اندر لانا ہے۔"[۳]

ڈاکٹر صادق جلال العظم کا کہنا ہے۔ "گلوبلائزیشن تمام ممالک کو ایک مرکزی ملک، امریکہ کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے۔"[۴]

ڈاکٹر مصطفیٰ انشار کہتے ہیں:

"گلوبلائزیشن کا مطلب ہرگز مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنا نہیں بلکہ اس کا مطلب تمام مقامی اور قومی تہذیبوں کو مٹا کر پوری دنیا کو مغربی رنگ میں رنگ دینا ہے۔"[۴]

گلوبلائزیشن کے تعلق سے مغربی مفکرین کی صراحتوں اور عالم اسلام کے اربابِ فکر و قلم کی انکشافات سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ گلوبلائزیشن کا مقصد نہ تو انسانی وحدت اور بین الاقوامی مساوات کا قیام ہے اور نہ ہی اقوامِ عالم کو یکساں ترقی و تجارت کے مواقع فراہم کرنا، بلکہ اس کا بنیادی مقصد پوری دنیا پر امریکہ اور یہودیت کی بالادستی قائم کرکے مذاہب عالم کے دینی و ثقافتی تشخصات کو ختم کرنا اور اقتصادی طور پر پوری دنیا کو اپنا دست نگر بنانا ہے، اس راہ میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ اسلام اور مسلمان ہیں۔

گلوبلائزیشن کا دائرۂ کار: گلوبلائزیشن کے نام سے یہودیوں کی قدیم ترین تحریک کی تجدید و احیا کا مقصد چوں کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو صیہونیت کے زیرِ اثر کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اقوامِ عالم کے سامنے گلوبلائزیشن کو مکمل ضابطۂ حیات بنا کر پیش کیا گیا اور اس کے دائرۂ اثر کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے متعدد شعبے قائم کیے گئے۔ اصول و ضوابط کی تدوین ہوئی۔ مختلف شعبوں کے لیے کارندوں کی سرگرم جماعتیں منتخب کی گئیں۔ اب گلوبلائزیشن کا دائرۂ عمل جن خاص امور کا احاطہ کرتا ہے ان میں سیاست، اقتصاد، تہذیب و ثقافت اور اخلاق و معاشرت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سیاسی گلوبلائزیشن: یہودیوں کے اندر کبر و نخوت کا عنصر حد درجہ پایا جاتا ہے۔ یہ قوم اقوامِ عالم پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے کسی بھی غیر انسانی عمل سے گریز نہیں کرتی۔ ان کا ایک دیرینہ خواب یہ ہے کہ پوری دنیا میں اپنی بالادستی قائم کرکے ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی باگ ڈور بظاہر اقوام

متحدہ کی "سلامتی کونسل" کے ہاتھ میں ہو لیکن پس پردہ اس کے سیاہ و سفید کا مالک یہودی لابی ہو، دنیا بھر کی حکومتوں کے اختیارات محدود کر دیے جائیں اور ان کی حیثیت ایسی ہی ہو جیسی کسی ملک میں ایک سرگرم تنظیم کی ہوا کرتی ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور دفاعی امور سے متعلق سارے اختیارات عالمی حکومت کے ہاتھ میں ہوں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیویارک ٹائمس (New York Times) نے امریکی وزارتِ دفاع کی تجزیاتی رپورٹ کے ذیل میں لکھا تھا:

"حکومتوں کے غیر ذمے دارانہ تصرفات پر پابندی ضروری ہے اور یہ کام بغیر عالمی نظامِ حکومت کے قیام کے ممکن نہیں۔ جس طرح بین الاقوامی عدالت حکومتوں کا محاسبہ کرتی ہے اسی طرح ہم تمام ملکوں کو ایک دائرے میں لانا چاہتے ہیں۔"(۵)

سیاست کی عالم کاری بلفظ دیگر عالمی حکومت کے قیام سے جو خطرناک نتائج عالمِ اسلام پر مرتب ہوں گے، اس کا اندازہ ڈاکٹر صالح الرقب کے اس تجزیے سے لگایا جا سکتا ہے:

"اسلامی ممالک کی طاقت ور قیادت کو ہٹا کر کم زور اور نالائق قیادت مسلط کرنا اور امریکی مفاد میں کام کرنے والی قیادتوں کو تحفظ بخشنا سیاسی عالم گیریت کے لائحۂ عمل میں شامل ہے۔ کیوں کہ عالمِ اسلام کی قیادت اگر مغرب کی غلامی کرتی رہی تو وہاں کے عوام اور ان کی تمام تر دولت پر امریکہ ہی کا قبضہ ہوگا اور عالمِ اسلام کا قلب جو یہودی قوم کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، بہ آسانی امریکی پالیسیوں اور **عالمی** حکومت کے احکام کی بنیاد پر مکمل طور سے یہودیوں کے پاس آجائے **گا**۔"(۶)

مندرجہ **بالا** سطور میں یہودیوں کے جن خطرناک عزائم کا ذکر ہوا وہ محض **نظریاتی** اور فکری نہیں ہیں بلکہ ان پر عمل در آمد کے لیے میڈیا کے **مختلف** شعبوں کو استعمال کر کے تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کی ذہن سازی کا عمل جاری ہے۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں آپ اپنے ہی گرد و پیش کے حالات کا بیدار مغزی سے جائزہ لیں اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات اور اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ذریعہ نشر کیے جانے والے بیانات پر غور کریں تو عملی دنیا میں بھی گلوبلائزیشن کے بڑھتے اثرات بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے سابق جنرل سکریٹری ڈاکٹر "بطرس غالی" اپنی کتاب "عالمی حکومت" میں گلوبلائزیشن کے نفاذ کے مختلف مراحل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دوسرے مرحلے میں تدریجی طور پر اقوامِ متحدہ کی بین الاقوامی فوج کی تشکیل کی جائے گی۔ تیسرے مرحلے میں بڑے سرعت سے تمام ملکوں کو جوہری اسلحوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس طرح کسی بھی ملک کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ اقوامِ متحدہ کی طاقت ور فوج کو چیلنج کر سکے۔"(۷)

سیاسی عالم کاری کا ایک خطرناک مقصد جو براہِ راست مسلمانوں سے متعلق ہے، یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے داخلی اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر کے افتراق و انتشار کا شعلہ اس قدر بھڑکا دیا جائے کہ انھیں خارجی امور پر توجہ دینے کا موقع ہی نہ مل سکے اور وہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر بیرونی طاقتوں سے مقابلے کی پوزیشن میں نہ رہ جائیں۔ ماضی قریب میں عراق، شام، لبنان، افغانستان کے سیاسی حالات اس منصوبے کی عملی شکلیں ہیں۔ یہودیوں کی ان فریب کاریوں کو سمجھنا اور عالمِ اسلام کا تحفظ نیز یہودی سازشوں کے تدارک کے لیے یہ موثر تدابیر اور نئی راہوں کی تلاش اسلامی مملکتوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔

اقتصادی گلوبلائزیشن: اقتصادی گلوبلائزیشن کا مطلب یہ ہے کہ صنعت و تجارت کے لیے ملکی سطح پر جو شرائط اور قوانین نافذ ہیں انھیں ختم کر دیا جائے تاکہ صنعت و تجارت کے میدان ملکی حدود میں محدود نہ رہ جائیں اور ہر شخص کو انفرادی یا اجتماعی شکل میں غیر ملکی تجارت مین سرمایہ کاری کر کے اس کے بدلے نفع حاصل کرنے کا حق حاصل ہو، اسی کو عالمی تجارت بھی کہتے ہیں۔

اقتصادی گلوبلائزیشن کے حامیوں کا کہنا ہے کہ صنعت و تجارت کے ملکی شرائط اور پابندیوں کو ختم کر دیا جائے اور ہر فرد یا جماعت کو عالمی تجارت میں سرمایہ کاری کرنے کا موقع دیا جائے تو عالمی طور پر غربت کا خاتمہ ہوگا۔ بے روزگاری دور ہوگی اور انسانی ضروریات سے متعلق چیزیں مناسب قیمتوں پر دستیاب ہوں گی، ہر ملک کا سامان ہر بازار میں فروخت ہو سکے گا۔ بعض وہ چیزیں جن تک صرف اہلِ ثروت حضرات ہی کی رسائی ہوتی ہے، معاشرے کے تمام افراد کے لیے مہیا ہو سکیں گی۔ لیکن اقتصادی گلوبلائزیشن کے طریقۂ کار اور اس کے اصول و ضوابط کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر انکشاف ہوتا ہے کہ اقتصادیات کی عالم گیریت کا مقصد دنیا سے غربت و مفلسی کا خاتمہ اور خوش حالی کا حصول نہیں بلکہ اقوامِ عالم کا فقر و فاقہ اور غربت

کی دلدل میں پھنسانے کی گھنونی سازش ہے۔ اس سے عام لوگ غذائی بحران اور کساد بازاری کے شکار ہوں گے۔ خوش حالی صرف ان کمپنیوں کے مالکان کے گھروں میں آئے گی جو یہودیوں کے آلۂ کار اور یہودی تحریک کے سرگرم رکن ہیں۔

اقتصادی عالم گیریت کے نام پر یہودیوں کی منصوبہ بند سازش یہ ہے کہ اقوامِ عالم پر اقتصادی بالادستی قائم کرنے کے لیے متعدد ملٹی نیشنل (Multi National) کمپنیاں وجود میں لائی جائیں اور انھیں دنیا کے مختلف حصوں میں نہایت منظم انداز میں سرمایہ کاری پر لگا دیا جائے، پھر ان کمپنیوں کے توسط سے عالمی اقتصادیات کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی مرضی کے مطابق اس کو فروغ دیا جائے۔ بظاہر یہ کمپنیاں اپنے متعلقہ ممالک کو ٹیکس ادا کریں گی اور ان ممالک کو فائدہ بھی ہوگا لیکن اصل فائدہ کمپنیوں کے ان مالکان کے حق میں ہوگا جو یہودی تحریک کے روحِ رواں ہیں۔ مثلاً ایک روپے کے سامان میں ۳۰/پیسے اس کے بنانے میں خرچ ہوتے ہیں۔ ۱۰/پیسے بطور ٹیکس مقامی حکومت کو دے دیے جاتے ہیں جب کہ ۲۵/پیسے مالکان اپنے ملک کو ٹیکس ادا کرتے ہیں، باقی ۳۵/پیسے کمپنی مالکان کے توسط سے یہودی تحریک کے بیت المال میں پہنچتے ہیں۔ اس طرح ہر ملک کے ہر فرد کی کمائی کا بڑا حصہ یہودی تحریک کے فروغ اور صیہونی منصوبوں کی تکمیل میں استعمال ہوتا ہے۔

یوں تو اقتصادی گلوبلائزیشن کے اصول و ضوابط کے مطابق کسی بھی ملک کو دوسرے ممالک کی منڈیوں میں تجارت اور سرمایہ کاری کی پوری آزادی ہے، لیکن عملی طور پر اس کا فائدہ زیادہ تر غیر ایشیائی کمپنیوں ہی کو پہنچ رہا ہے۔ تجارتی منڈیوں میں مغربی اور جاپانی کمپنیوں کا غاصبانہ قبضہ ہے جو آپس میں مقابلہ آرائی اور قیمتیں کم کر کے صارفین کی آمدنیوں کو ہڑپ رہی ہیں۔ آج ہندوستان سمیت تمام ایشیائی ممالک میں ضروریاتِ زندگی کے اکثر سامان جاپانی اور غیر ایشیائی کمپنیوں کے استعمال ہوتے ہیں اور خریداری کے وقت عام آدمی کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہمارے اس روپے کا فائدہ کس کے حق میں جا رہا ہے۔ اقتصادیات کی طرف اہلِ مغرب کی توجہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ماکولات و مشروبات کے میدان میں بھی سرمایہ کاری کر کے لوگوں کو اس کی جانب راغب کرنے اور اپنی مصنوعات کو عام کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کی مختلف صورتوں کو بڑی مہارت سے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ مسلسل اشتہارات کے ذریعہ مکڈانالڈ (Micdonald) ریسٹورینٹ، کوک، پیپسی وغیرہ ماکولات و مشروبات کو معیارِ زندگی باور کر کے اپنی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے ساتھ ساتھ اقتصادی فائدے بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اس تہذیبی و اقتصادی استحصال کے شکار دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہو رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے سب سے قدیم مرکز سعودی عرب کے شہر ریاض میں جب پہلی بار فاسٹ فوڈ ریسٹورینٹ مکڈانالڈ (Micdonald) کھلا تو عرب روسا اتنی بری تعداد میں اپنی گاڑیوں سے وہاں پہنچے کہ آس پاس کی تمام بڑی شاہ راہوں پر ٹریفک جام ہو گیا۔ محکمۂ ٹریفک کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ سارے شیوخ فاسٹ فوڈ کھانے مکڈونالڈ ریسٹورینٹ جا رہے ہیں۔ امریکی کمپنیاں ہندوستان میں بھی مکڈانالڈ اور پزا (Pizza) جیسے کئی ریسٹورینٹ کو فروغ دے کر اقتصادی استحکام حاصل کر رہی ہیں اور جدیدیت سے متاثر ہندوستانی معاشرے کے اہلِ ثروت ہندوستانی طرز کے ہوٹلوں کے بجائے امریکی کلچر کے نمائندہ ان ریسٹورینٹ کو ترجیح دے کر ان کی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی کمپنیوں کی جھولی میں ڈال رہے ہیں۔

اقتصادی عالم گیریت کے خاص نشانے عرب ممالک ہیں۔ ایک سروے کے مطابق ہر منٹ میں عرب ممالک ۵۰/ہزار ڈالر کے مقروض ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ گلوبلائزیشن ہی کی دین ہے۔ رفتہ رفتہ ان قرضوں کی وجہ سے مغربی حکومتوں کو عرب ممالک میں دخل اندازی کر کے وہاں کی حکومت کو اپنے رحم و کرم میں لینے کا موقع فراہم ہو جائے گا۔

اقتصادی عالم گیریت کے نقصانات کا اعتراف حقیقت پسند مغربی مفکرین بھی کرتے ہیں۔ مسٹر فلپ ایف کیلی (Phillip F. Kally) گلوبلائزیشن کے حامی ہیں لیکن انھیں بھی اعتراف ہے کہ:

"گلوبلائزیشن حد سے تجاوز کر چکا ہے، اگر یہ اقتصادی فلاح کا راستہ ہے تو اقتصادی بحران کا بھی بڑا ذریعہ ہے۔ اس کا مواخذہ اور احتساب ضروری ہے۔"(۸)

ثقافتی گلوبلائزیشن: تہذیب و ثقافت کا اصل عنصر مذہب ہے۔ مذہب ہی قوم کے مزاج، لباس، رہن سہن، طریقۂ

خورد و نوش اور رسوم و رواج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے تہذیب و ثقافت کو ترک کرنا در اصل مذہب سے دوری اختیار کرنا ہے۔ گلوبلائزیشن کے علم بردار سیاست اور معیشت کی عالم کاری کے بعد ثقافت کی بھی عالم کاری کے درپے ہیں۔

ان کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں مغربی بلکہ امریکی اقدار کا غلبہ رہے۔ پوری دنیا پر امریکی تہذیب و تمدن مسلط کر دیا جائے۔ رنگ و نسل میں اختلاف تو پایا جائے لیکن رہن سہن، زبان و بیان اور معیارِ زندگی ایک ہو۔ ایک ہی زبان پوری دنیا کی زبان ہو، بقیہ زبانوں کو فرسودہ قرار دے کر تاریخ کے حوالے کر دیا جائے۔ لوگ سوچیں تو امریکی طرزِ فکر پر سوچیں، بولیں تو امریکی طرزِ تکلم میں بولیں، کھائیں تو امریکی طرز کا کھانا کھائیں۔ دنیا کی تمام قوموں کی ضرورتیں ایک ہوں تاکہ زندگی کی مختلف ضروریات سے متعلق ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات کے صارفین ہر ملک میں موجود ہوں۔

بصیرت کی نگاہوں سے دیکھا جائے تو گلوبلائزیشن کا سب سے خطرناک پہلو ثقافتی عالم گیریت ہی ہے، سیاست اور اقتصادیت کی عالم کاری کا تعلق مادیت سے ہے جب کہ تہذیب و ثقافت کی عالم کاری کا تعلق براہِ راست مذہب سے ہے، خصوصاً مذہبِ اسلام سے، کیوں کہ اسلامی تہذیب و تمدن مذہبِ اسلام کا ایک اہم جزو ہے، دنیا کی تمام تہذیبوں کو ختم کر کے مغربی تہذیب و ثقافت کو مسلط کرنے کا منصوبہ مذہبِ اسلام کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے۔

گلوبلائزیشن کے حامیین یہودی تہذیب و ثقافت کو مثالی اور قابلِ تقلید قرار دینے کے لیے ذرائع ابلاغ اور مواصلاتی نظام کا پوری طرح استعمال کر رہے ہیں، عالمی میڈیا میں انھوں نے ایسا اثر و رسوخ قائم کر لیا ہے کہ کوئی بھی خبر ان کی رضا اور منظوری کے بغیر منظرِ عام پر نہیں آتی۔ وہ جس خبر کو جس انداز میں چاہتے ہیں پیش کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج یہودی ذرائع بلاغ اس پوزیشن میں ہے کہ وہ دنیا کو جس نہج پر جس سمت لے جانا چاہے لے جا سکتا ہے، جس تہذیب و ثقافت کو معیارِ زندگی قرار دے دے، لوگ اس کو عملی جامہ پہنانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں، یہ میڈیا ہی کی دین ہے۔

ہر قوم کا لباس اس کی تہذیب و ثقافت کا مظہر ہوتا ہے، لیکن یہودیوں نے اقوامِ عالم کی قومی و مذہبی تشخصات کو ختم کرنے کے لیے میڈیا اور وسیع پیمانے پر نشر ہونے والی فلموں کا سہارا لے کر بوڑھے بچے، جوان لڑکے اور لڑکیوں کو مغربی لباس کا دل دادہ بنا دیا ہے۔ لباس کی دنیا میں صنفی امتیازات بالکلیہ ختم ہو چکے ہیں۔ عرب قوم جو اپنے مخصوص لباس کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک امتیازی شناخت رکھتی ہے وہ بھی اپنے قومی و مذہبی لباس کو ترک کر کے مغرب کی تقلید کو باعثِ فخر و مباہات سمجھنے لگی ہے۔ یہودیوں کی مسلسل سازشوں کے طفیل اسلامی لباس کو ''دہشت گردی'' کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔ طریقۂ خورد و نوش میں بھی امریکی تہذیب کو بڑے منظم انداز میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ مکڈونالڈ، ہیم برگر گ (Hamburgerg)، ہاٹ ڈاگ (Hot Dog) اور پزا (Pizza) جیسے ریسٹورینٹ کو فروغ دینے کے لیے امریکہ نے باضابطہ ایسے ادارے قائم کر رکھے ہیں جہاں ان ہوٹلوں میں کام کرنے والے افراد کو تربیت دی جاتی ہے۔

غرض کہ آج امریکی ثقافت پوری دنیا میں پورے آب و تاب کے ساتھ فروغ پا رہی ہے، شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ہو جہاں اس سیلاب نے تباہی نہ مچائی ہو، گلوبلائزیشن کے اس ثقافتی حملے کی زد میں دنیا کی تمام تہذیبیں ہیں، لیکن اصل ہدف اسلامی تہذیب ہے کیوں کہ گلوبلائزیشن کے علم برداروں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کا خواب اسلامی تہذیب کو ختم کیے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

گلوبلائزیشن کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں بلند فکری اور مومنانہ بصیرت سے کام لینا ہوگا، اسلامی اصول و ضوابط اور تہذیب و ثقافت پر سختی سے عمل پیرا ہونا ہوگا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ کوئی پہلی سازش نہیں ہے جس سے گھبرا کر ہم ہمت ہار بیٹھیں، اسلام ہر دور اور ہر زمانے میں طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما رہا ہے۔ لیکن تائیدِ ایزدی سے اسلام کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہو سکا، مٹانے والے خود تو مٹ گئے لیکن اسلام کا چمن اب بھی سرسبز و شاداب ہے۔

------☆☆ ماخذ و مراجع ☆☆------

١. لم یخشی العولمہ، زین العابدین حماد، العالم الاسلامی ۲۲ / محرم ۱۴۲۲ء۔
٢. New College Dictionry, p-521، بحوالہ اسلام اور گلوبلائزیشن، یاسر ندیم۔
٣. العولمہ: ص: ۶، ڈاکٹر صالح الرقب، بحوالہ اسلام اور گلوبلائزیشن۔ یاسر ندیم۔
٤. رسالہ المنتدی، اگست ۱۹۹۹ء، بحوالہ سابق۔
٥. New York Times, 4 Aug. 99، بحوالہ مغربی میڈیا، ص: ۸۵۔
٦. العولمہ، از ڈاکٹر صالح الرقب، بحوالہ اسلام اور گلوبلائزیشن۔
٧. مغربی میڈیا، ص: ۸۵۔
٨. Question Incrisis, p-2، بحوالہ اسلام اور گلوبلائزیشن۔

مرکزی مدرسہ بورڈ

ہندوستانی مسلمانوں کا جمہوری حق

مرکزی مدرسہ بورڈ کی حمایت نے اب ملک بھر میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ علمائے اہلِ سنت متفقہ طور پر بورڈ کی مشروط حمایت کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں باضابطہ ایک کمیٹی بنام "آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی" کی تشکیل عمل میں آچکی ہے، کمیٹی نے جاری شدہ ایکٹ میں ترمیم و اصلاح کے بعد اپنی سفارشات مرکزی وزیر تعلیم کو سونپ دی ہیں۔ اہلِ سنت کے تمام رسائل و جرائد مسلسل اس کی حمایت میں لکھ رہے ہیں۔ جگہ جگہ اس کی حمایت میں پروگرام ہو رہے ہیں، اخبارات میں بیانات جاری کیے جا رہے ہیں۔ اس مہم کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، انڈیا نیوز ویکلی دہلی نے بھی مرکزی مدرسہ بورڈ کے حوالے سے اپنی کور اسٹوری شائع کر دی ہے، جس میں علمائے دیوبند کی بے بنیاد مخالفت پر علمائے اہلِ سنت کی حمایت کو ترجیح دی گئی ہے۔ مدارسِ اہلِ سنت کے ذمہ داروں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اولین فرصت میں مدارس کے لیٹر پیڈ پر چند سطروں میں بنام مرکزی وزیر کپل سبل اپنا مطالبہ لکھیں کہ ہم آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی کی پیش کردہ ترمیم و اصلاح کے مطابق مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل چاہتے ہیں، مطالبہ نامہ مرکزی وزیر تعلیم کو ارسال کریں یا حسبِ ذیل پتے پر ارسال کریں تاکہ حکومت کو باضابطہ پیش کیا جا سکے۔

مبارک حسین مصباحی۔

کنوینر آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی۔ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ یو۔پی۔

سید تنویر الدین خدا نمائی

— صدر شعبۂ فارسی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد —

جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر سید تنویر الدین خدا نمائی سے "مرکزی مدرسہ بورڈ" کے حوالے سے سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا جمہوری حق ہے اور اس کی تشکیل ہمارے لیے ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا کہ ۳/ دسمبر ۲۰۰۶ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی میٹنگ میں شریک تھا، جس کی صدارت مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ کر رہے تھے اور جسٹس صدیقی صاحب نے اس میٹنگ کو بلایا تھا۔ اس میں ممتاز ماہر تعلیم مسٹر فاطمی سینٹرل منسٹر بھی شریک تھے۔ صبح ۱۰ بجے سے شام ۶/ بجے تک میٹنگ چلتی رہی، لوگ اظہارِ خیالات کرتے رہے۔ جس میں ۹۵/ تا ۹۷/ فی صد دیوبندی، ندوی، وہابی، جماعت اسلامی کے لوگ شریک تھے۔ اہل سنت کی چند لوگوں نے نمائندگی کی۔ اس میں یونیورسٹی کے دانش وروں کی بھی نمائندگی تھی۔

یہاں پر دیوبندی، ندوی، جماعت اسلامی اور وہابی لابی نے مدرسہ بورڈ سے متعلق جن خدشات اور اندیشوں کا ذکر کیا وہ بے بنیاد اور سطحی تھا، مدرسہ بورڈ سے متعلق جو لٹریچر جسٹس صدیقی صاحب نے فراہم کیے تھے ان لوگوں نے ان کی ایک سطر بھی پڑھنا گوارا نہیں کیا، جب کہ اس میں ان کے ہر ایک خدشات کا جواب موجود تھا۔ اس میٹنگ میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یو۔پی۔ سارے ہندوستان کی نمائندگی کر رہا ہے اور دیوبند تمام مسلمانوں کی، جب کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ یو۔پی۔ سارے ہندوستان کا نمائندہ نہیں ہے اور دیوبند تمام وہابیوں کا ضرور نمائندہ ہو سکتا ہے لیکن تمام مسلمانوں کا ہرگز نمائندہ نہیں ہو سکتا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہابیوں کو تمام مسلمانانِ ہند کا نمائندہ نہ سمجھے۔ دن رات اقتدار کے اطراف گھومنے والے کبھی بھی مسلمانوں کے حقیقی نمائندے نہیں ہو سکتے۔

اس سیمینار میں وہابی لابی کے ذمے دار بیرونی ممالک سے فنڈ حاصل کرنے کے اجازت ناموں کو حکومت کی جانب سے عدم اجرائی پر احتجاج کرنے میں اپنا وقت ضائع کر رہے تھے اور یہ بات بھی کہہ رہے تھے کہ ہماری پانچ ہزار درخواستیں منظوری کے لیے زیرِ التوا پڑی ہوئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیوں مرکزی مدرسہ بورڈ کی مخالفت کر رہے ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ بھی مسلمانوں کا تنہا نمائندہ نہیں رہا، کیوں کہ وہابیوں نے اسے ہائی جیک کر لیا ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ

تمام مسلمانوں کا فیصلہ نہیں ہے۔ حکومت خود مسلم تعلیمی اداروں سے رائے لے کر فیصلہ کرے اور مرکزی مدرسہ بورڈ کو فوری قائم کرے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے ممتاز ماہر تعلیم پی. کے. انعام دار پونہ مہاراشٹر جن کے صرف ایک ادارے میں پچیس ہزار طلبہ و طالبات کے. جی. (K.G.) سے پوسٹ گریجویٹ (P.G.) تک کئی پروفیشنل کورسیز میں زیر تعلیم ہیں، اس سیمینار میں شریک تھے اور مرکزی مدرسہ بورڈ کی تائید کر رہے تھے۔ جناب شیخ ابو بکر احمد کالی کٹ جن کی تعلیمی خدمات سے کیرالا کا گوشہ گوشہ روشن ہے۔ آپ جیسے مسلمانوں کی علمی نمائندگی کرنے والوں نے مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کی پُرزور تائید کی۔

از: احمد حسن رضوی قادری
چیف ایڈیٹر ماہ نامہ بطحا، حیدر آباد

مجلس علمائے اسلام، مغربی بنگال

لال مسجد، اکرا روڈ، منیا برج، کولکاتا

مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام پر پورے ہندوستان میں ایک اضطرابی کیفیت پائی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ (علمائے دیوبند) شدت کے ساتھ بورڈ کے قیام کی مخالفت کر رہا ہے جب کہ قیام کی صورت میں دس ممبران میں سے ۷/ ممبران کے خواہاں بھی ہے۔ دوسرا طبقہ (علمائے اہل سنت) بورڈ کے قیام کو مشروط طور پر ماننے کو تیار ہے۔

واضح رہے کہ ۳/ نومبر ۲۰۰۹ء کو مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل کپل سبل نے مسلم ممبران پارلیمنٹ کی ایک میٹنگ بلائی جس میں مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کی تجویز رکھی اور ایک مسودہ تمام شرکا میں تقسیم کیا گیا کہ کس نہج اور ضابطے کے تحت بورڈ کو عملی شکل دی جائے، وہ تفصیلات پڑھ لیں۔ ان تفصیلات پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ باتیں سامنے آئیں کہ مذکورہ مسودہ کو اگر مسلمان من و عن تسلیم کر لیں تو اس سے علم دین کی روح نکل جائے گی، ساتھ ہی ساتھ علم دین کے اصل مغز سے طلبہ دور ہوتے چلے جائیں گے اور مدارس کی حقیقی شناخت ختم ہونی شروع ہو جائے گی۔ ان خدشات سے بچنے کے لیے عالم، اسلام کی عظیم اسلامی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ کے ارباب حل و عقد اور آل انڈیا مدرسہ کو آرڈی نیشن کمیٹی نے مرکزی حکومت کو جو سفارشات پیش کی ہیں ہم ان کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔

مغربی بنگال کے علما اور ارباب علم و فکر نے بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ ملکی سطح پر اس سلگتے ہوئے مسئلہ پر لائحہ عمل طے کرنے کے لیے مجلس علمائے اسلام مغربی بنگال کے بینر تلے ۱۲/ نومبر ۲۰۰۹ء کو ایک نشست کلکتہ کے زکریا اسٹریٹ، صالح جی مسافر خانہ میں ہوئی۔ کثیر تعداد میں شریک علما اور عمائدین اسلام نے بورڈ کے حوالے سے تفصیلی بحثیں کیں اور الجامعۃ الاشرفیہ کی پیش کردہ تمام تجاویز پر اتفاق رائے سے مہر تصدیقات ثبت کیں۔ نیز مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسودہ میں ترمیم کر کے جامعہ اشرفیہ کی تجاویز شامل کی جائیں اور مسلم اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کا صحیح حل پیش کریں۔

از: مولانا محمد شاہد القادری
معاون سکریٹری جنرل مجلس علمائے مغربی بنگال

رضا اکیڈمی کے اجلاس میں علمائے ممبئی کا متفقہ فیصلہ

امت کے نام نہاد قائدین اب تک اپنی جیب اور اپنے منصب کو دیکھ کر فیصلے کرتے رہے ہیں، جس کی وجہ سے امت ہر نفع سے دور ضرر کا شکار رہی ہے۔ مرکزی مدرسہ بورڈ کا قضیہ مدارس اور اساتذہ کی ترقی کے لیے جب سامنے آیا تو بعض انھیں قائدین نے اپنے مفاد اور انا کو ٹھیس پہنچتی دیکھ کر اسے ٹھکرا دیا اور حکومتوں کی نیتوں پر شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے اس منصوبے کو دیدہ دلیری کے ساتھ نامنظور کرانے پر آمادہ ہو گئے۔ ہم حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عمومی ترقی کے لیے مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کرے۔ ہندوستان کی اکثریت حکومت کے اس فیصلے کا استقبال کرے گی۔

بحوالہ مسلم ٹائمز ممبئی
۲۱/ تا ۲۷/ دسمبر ۲۰۰۹ء

سنی کانفرنس مراد آباد کا پرزور مطالبہ

سنی کانفرنس مراد آباد سے خطاب کرتے ہوئے مولانا توقیر رضا خاں صدر اتحاد ملت نے کہا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید اور آل انڈیا کو آرڈی نیشن کمیٹی کے ذریعہ دی گئی ترمیمات اور طلب کردہ وضاحت کے ساتھ مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔

میڈیا انچارج: سید بابر اشرف
آل انڈیا علما و مشائخ بورڈ، کچھوچھہ شریف

مستقل کالم | **فکر و نظر** | **بزمِ دانش**

نکسلائٹ تحریک

ملکی امن و استحکام کے لیے ایک بڑا چیلنج

"**بزمِ دانش**" میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم ارباب قلم اور علمائے اسلام کو آواز دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ **از: مبارک حسین مصباحی**

مارچ ۲۰۱۰ء کا عنوان — ملی مسائل اور ہماری بے حسی

اپریل ۲۰۱۰ء کا عنوان — دعوت و تبلیغ کا نبوی اسلوب

نکسلزم مروجہ دہشت گردی سے بھی زیادہ خطرناک ہے

غالباً معاشی استحصال اور سیاسی عدم مساوات کے نتیجے میں ۵/ مئی ۱۹۶۷ء میں نکسل واد کا جنم ہوا۔ اسی سال انھوں نے اپنی پارٹی کی تشکیل دی اور باضابطہ ۲۰۰۴ء میں مرکزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کیا۔ ان کا ٹریننگ سینٹر معدنیاتی وسائل سے بھرپور ریاست جھارکھنڈ میں ہے اور مغربی بنگال، بہار، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کے بعض علاقوں میں بھی ان کا اچھا خاصا اثر و رسوخ ہے۔ ان کی مٹھی بھر جماعت اپنے زمانۂ قیام سے اب تک تشدد پسندانہ کارروائیوں میں ملوث رہی ہے۔ یہ لوگ پولیس افسران اور سیاسی لیڈروں کو قتل کرتے ہیں، سرکاری املاک کو تباہ کرتے ہیں، اسکولوں، کالجوں اور موبائل ٹاوروں کو دھماکے سے اڑا دیتے ہیں۔ سڑکوں اور ریلوے کو نقصان پہنچانا ان کے لیے چھوٹی سی بات ہے۔ عوام کو ڈرا دھمکا کر ان سے موٹی رقمیں وصول کرنا ان کا روزمرہ کا معمول ہے۔ غرض ایک متمدن معاشرہ ان کی کارگزاریوں کے سبب بری طرح تشدد کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ ان کی کارکردگی کا ایک مختصر جائزہ ملاحظہ کیجیے۔

گزشتہ ۳/ برسوں میں نکسلی تشدد کے نتیجے میں ۲۶۰۰/ جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق نکسلی تشدد سے متاثر چار ریاستوں، چھتیس گڑھ، بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ میں ہی جنوری ۲۰۰۶ء سے اگست ۲۰۰۹ء کے درمیان تقریباً ۲۲۱۲/ افراد مارے جا چکے ہیں۔ صرف ریاست جھارکھنڈ میں جنوری ۲۰۰۳ء سے اب تک ۳۳۹/ پولیس افسران ان کے تشدد کا شکار ہو چکے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کے ایک سینیر افسر کے بیان کے مطابق تین سال کے درمیان ۵۸۰۰/ نکسلی واردات ہوئے ہیں۔ وزیر داخلہ پی. چدمبرم کے مطابق ملک کی ۲۰/ ریاستوں میں ماؤنوازوں کا اثر ہے۔ طرفہ یہ کہ ریاستی حکومتیں ان کے خلاف کوئی ٹھوس اقدام کرنے سے عاجز ہیں۔ چھتیس گڑھ کے امور داخلہ کے وزیر ننکی رام کنور نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ماؤنوازوں کا نیٹ ورک ریاستی حکومت کے مقابلے میں کافی مضبوط ہے۔ باغی ماؤنواز کئی محاذوں پر سلامتی دستوں پر بھاری پڑ رہے ہیں۔ اس صورت حال سے پریشان ہو کر وزیر داخلہ پی. چدمبرم نے ماؤنوازوں اور نکسلیوں کو وارننگ دی کہ وہ تشدد ترک کریں اور مذاکرات کے ذریعہ مسائل کے حل کے لیے آگے آئیں ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

وزیر داخلہ کے اس بیان کے بعد وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بھی اپنے ایک بیان میں ماؤنوازوں (نکسلیوں) کے خلاف سخت گیر

موقف اختیار کیا اور نکسلی تحریک کو ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا، ساتھ ہی ان سے نمٹنے کے لیے ۴۰/ ہزار نیم فوجی دستوں کو شامل کیا نیز ۷۳۰۰/ کروڑ کے پیکیج کا بھی اعلان کیا۔ لیکن جس اعلیٰ پیمانے پر انھوں نے تشدد کا تانڈو برپا کیا ہے کہ مرکزی حکومت اور فوجی دستوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

وزیر داخلہ نے یہ بھی کہا ہے کہ انھیں بنگلہ دیش، میانمار اور نیپال سے اسلحہ مل رہا ہے۔ نیز ایک خبر کے مطابق نیپالی ماؤنوازوں نے ہندوستانی ماؤنوازوں کی حمایت اور تعاون کا اعلان بھی کیا ہے۔ لیکن یہ تعاون کس نوعیت کا ہے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ بہر حال مذکورہ بالا حقائق کے مدِ نظر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ نکسلی ملکی امن و استحکام کے لیے ایک زبردست چیلنج بن چکے ہیں۔ بلکہ نکسلی تحریک کا بغور مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ یہ مروجہ دہشت گردی سے بھی زیادہ خطرناک ہے، کیوں کہ اس میں نسبتاً جان و مال کا اتلاف زیادہ ہو رہا ہے۔ نکسلیوں کی اس تحریک کو ناکام بنانے اور متاثرہ ریاستوں میں امن و امان کی صورت بحال کرنے کے لیے مرکز اور ریاست دونوں کو ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ فوجی طاقت کے استعمال کے بجائے نکسل وادی تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب پر بھی غور کرنا ہو گا، مزید گفت و شنید کی راہیں بھی اختیار کرنی ہوں گی۔ اس کے ضمن میں مقامی لوگوں کا تعاون بھی آسانیاں فراہم کر سکتا ہے۔ اگر اس معاملے میں تساہلی سے کام لیا گیا تو یہ تحریک دن بہ دن مستحکم ہوتی جائے گی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان سے نمٹنا بھی مشکل ہو تا جائے گا۔

از: سید محمد جید ربانی، جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اوریا

نکسلیوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھالیے ہیں

مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے چاروں مجمدار اور کانو سانیال نے چین کے انقلابی رہ نما "ماؤزیدونگے" کے نظریہ سے متاثر ہو کر سرزمین بنگال میں "ریولیوشنری" اپوزیشن پارٹی تشکیل دی۔ اس پارٹی نے ۱۹۶۷ء میں مغربی بنگال کے نکسل واڑی گاؤں میں زمیں داروں کے خلاف "سنتھال" نامی پر تشدد بغاوت کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے اس تحریک کو "نکسلائٹ تحریک" کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد نکسلیوں کی کئی تنظیمیں بنیں۔ بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی مالے، بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی لینن وادی، بھارتیہ کمیونسٹ سینٹر اور پیوپلس وار گروپ (P.W.G.) حالاں کہ ۱۹۷۰ء میں بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی مالے کم زور پڑ گئی۔ اس کے بعد مارکس وادی کمیونسٹ سینٹر بہار، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ اور پیوپلس وار گروپ آندھرا پردیش میں سرگرم ہوئے۔ ۱۹۹۰ء کے درمیان نکسلیوں کے کارکنان کی تعداد ۳۰/ ہزار تھی جو ہتھیاروں سے لیس رہتے تھے۔ سی. پی. آئی. مالے نے ۲۰۰۰ء میں تشدد ترک کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے الیکشن میں حصہ لیا۔ لیکن .M.C.C اور .P.W.G نے ۲۰۰۴ء میں آپس میں ہاتھ ملالیا۔ اس کے بعد نئی تنظیم بھارتیہ کمیونسٹ (ماؤوادی) کا جنم ہوا۔ نکسلی تحریک کا اصل مقصد پولیس اور مال دار طبقہ کے ذریعہ غریبوں پر ہو رہے ظلم کا تدارک کرنا ہے۔ ملک کی ۱۵/ ریاستوں کے ۱۵۰/ اضلاع نکسلیوں کے زیر اثر ہیں جو نکسلی مختلف گروپوں میں آندھرا پردیش، بہار، بنگال، اڑیسہ، جھارکھنڈ، کرناٹک، یو. پی. کے کچھ حصے اور چھتیس گڑھ میں سرگرم ہیں۔ لیکن سبھی نکسلی گروپ بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی (ماؤنواز) سے جڑے ہیں۔ ان علاقوں کا ریڈ الٹرا (لال گلیارہ) کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ نکسلیوں نے اپنی تنظیم میں بھرتی کی عمر بھی طے کر رکھی ہے جو ۱۸/ سے ۳۰/ برس تک ہے۔ ان کی تنظیموں میں عورتوں کی بھی بھرتی ہوتی ہے۔ نکسلیوں کی باقاعدہ وزارت ہوتی ہے اور ان میں فوج کے طرز پر کمانڈر، جنرل، کرنل جیسے عہدوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ نکسلیوں کو دیہی عوام کی زبردست حمایت حاصل ہوتی ہے۔ جھارکھنڈ کے سینٹرل ریزرو پولیس کے ڈپٹی انسپکٹر آلوک راج کہتے ہیں: "ریاست میں نکسلیوں سے متعلق کئی گروپ سرگرم ہیں جو سالانہ ۱۵۰/ کروڑ روپے زمیں داروں، پٹرول پمپ مالکوں اور زمین مافیا سے وصول کرتے ہیں۔ نیز نکسلی انھیں رسید بھی دیتے ہیں۔ آج کل ماؤنوازوں کے سربراہ کشن جی ہیں۔ وہی پوری تنظیم کو چلاتے ہیں۔ جب داخلہ سکریٹری جے. کے. پلئی نے کہا کہ نکسلیوں کو دیسی ہتھیار چین سے حاصل ہوتے ہیں۔ تب کشن جی نے بی. بی. سی. ہندی سروس کو فون کر کے بتایا کہ "ہم لوگ تو خود ہی چین کے آج کل کے حالات سے

متفق نہیں ہیں تو ہم ان سے ہتھیار کیوں لیں گے۔ انھوں نے کہا نیپال کے ماؤنوازوں سے ہمارا رابطہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔"

نکسلی اپنے حلقۂ اثر میں جن عدالت (عوامی عدالت) لگاتے ہیں جس میں باقاعدہ گواہی اور گاؤں والوں سے مجرم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد اگر مجرم پر جرم ثابت ہو گیا تو وہیں پر مجرم کو سزا سنا دی جاتی ہے۔ اکثر دیہی عوام نکسلیوں کی جن عدالت سے فیصلہ کرواتے ہیں اور ایسا اس لیے ہے کہ عدالتوں کے ذریعہ فیصلے آنے میں برسوں لگ جاتے ہیں، نیز ہمارے عدالتی نظام میں کئی طرح کی خرابیاں رائج ہیں۔ قریب ۸/ ماہ پہلے کی بات ہے مغربی بنگال کے دیہی عوام نے نکسلیوں کے ساتھ مل کر لال گڑھ علاقہ پر اپنی متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ دیہی عوام نے ایسا اس لیے کیا کہ اس علاقہ کی سڑکیں خراب تھیں، نوجوان بے روزگار تھے، علاقہ میں حکومت کی طرف سے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس واقعہ نے حکومت کے پسینے چھڑا دیے تھے۔ کافی جد و جہد کے بعد فوجی دستوں نے لال گڑھ کو ماؤنوازوں سے آزاد کرایا۔ ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں ماؤنوازوں نے راج دھانی ایکسپریس کو ۱۰/ گھنٹے تک روک کر اپنی طاقت کا احساس کرا دیا تھا۔ ٹرین جب ماؤنوازوں سے آزاد ہونے کے بعد مغل سرائے اسٹیشن پہنچی تو بہت سے مسافروں نے روتے ہوئے اپنی داستانِ غم کچھ یوں بیان کی:

"ہماری مدد کے لیے کئی گھنٹوں تک پولیس نہیں پہنچی۔ ان سے تو اچھے ماؤ وادی تھے جنھوں نے ہمارا سامان پوچھ پوچھ کر دیا اور کہا کہ آپ لوگ ٹرین سے اتر جائیں، کیوں کہ ہم لوگ ٹرین کو آگ لگا دیں گے۔"

ان سب باتوں سے ایک بات صاف ہوتی ہے کہ حکومت کی پالیسیوں ہی کی وجہ سے نکسلزم بڑھا ہے۔ راہل گاندھی نے بھی اپنے جھارکھنڈ دورہ پر اس بات کو مانا کہ حکومت کے ذریعہ دیہاتوں (پس ماندہ علاقہ) میں ترقیاتی کام نہ پہنچنے کے سبب ہی نکسلزم بڑھا ہے۔ راہل گاندھی نے کہا کہ "ہمیں ملک کے ترقی یافتہ حصے اور اس کے پس ماندہ حصے جو کہ ترقی کی دوڑ میں کافی پیچھے رہ گئے ہیں، جوڑنا ہو گا۔" (سہارا، ۷/ اکتوبر ۲۰۰۹)

وزیر داخلہ پی. چدمبرم کہتے ہیں کہ "اگر نکسلیوں نے تشدد ترک نہ کیا تو ان کے خلاف سخت کارروائی ہو گی"۔ وزیر داخلہ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ آخر ایسے حالات پیدا ہی کیوں ہوئے کہ ہندوستان کے ہزاروں نوجوانوں کو حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑے۔ ماؤ وادی کوئی باہر سے تو نہیں آئے، بلکہ اسی سرزمین ہند میں پیدا ہوئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نکسلیوں کے ذریعہ کیا گیا تشدد صحیح ہے بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ آخر حکومت ان اسباب کا تجزیہ کیوں نہیں کرتی جن کی وجہ سے نکسلی پیدا ہوئے۔ در اصل جب تک غریبوں پر ظلم ہوتا رہے گا اور ترقیاتی کام دیہاتوں میں پوری طرح لاگو نہیں ہو جاتے تب تک نکسلزم کا خاتمہ ممکن نہیں۔

کچھ ماہ پہلے گوالیار (مدھیہ پردیش) سے تقریباً ۲۵/ ہزار لوگ دہلی آئے۔ مسئلہ تھا دبنگوں کے ذریعہ ان کی زمین چھیننے کا، حکومت کے ایک وزیر نے مظاہرہ کر رہے ان لوگوں کو یقین دہانی کرائی تب کہیں جا کر وہ واپس ہوئے۔ اب حکومت کو سمجھنا چاہیے کہ اگر ۲۵ ہزار لوگ ناامید ہو کر راج دھانی دہلی سے واپس جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ گوالیار دوسرا نکسلزم کا علاقہ بن جائے۔

وزیر اعظم منموہن سنگھ جو کہ ایک ماہر اقتصادیات ہیں، ان کا کہنا ہے کہ "نکسلزم داخلی استحکام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔" لیکن ماہرین اقتصادیات اس کی وجہ کیوں نہیں بتاتے؟ آخر ملک میں پلے بڑھے نوجوانوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھا لیے ہیں؟ آخر نکسلی تحریک حکومت کی لاکھ کوششوں کے باوجود کیوں بڑھ رہی ہے؟ نیز وزیر اعظم کو یہ بتانا چاہیے کہ نکسلیوں کی مختلف کارروائیوں کے باوجود دیہی عوام کی انھیں کیوں زبردست حمایت حاصل ہے؟

جب راقم الحروف یہ مضمون سپردِ قرطاس کر رہا تھا تو ایک دردناک خبر آئی کہ "کچھ ماہ پہلے جموں کشمیر میں جن دو لڑکیوں (آسیہ و نیلوفر) کی جن فوجیوں کے ذریعہ عصمت دری کی گئی تھی اور انھیں قتل کر دیا گیا تھا، ان فوجیوں کو سی. بی. آئی. نے کلین چٹ دے دی اور یہ بھی کہا کہ ان لڑکیوں کی موت قتل سے نہیں بلکہ نالے میں ڈوب جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ حکومت کو سمجھنا چاہیے کہ جب مظلوموں کے ساتھ حکومت اس طرح کی حرکت کرے گی تو کیا بے یار و مددگار مظلوم حکومت سے بغاوت نہیں کرے گا؟ اس لیے حکومت کو غریبوں کے ساتھ ہو رہے ظلم کا تدارک کرنا چاہیے۔ نیز پس ماندہ علاقوں میں ترقیاتی کام پر توجہ دی جائے اور ماؤنوازوں کے ساتھ مذاکرات کی بھی ضرورت ہے۔

از: سید احمد القادری، امجھر شریف، اورنگ آباد

اشعارِ رضا کی توضیح

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی

*** سوال ***

لے خبر جلد کہ غیروں کی طرف دھیان گیا
میرے آقا، میرے مولا، تیرے قربان گیا

پورا شعر جو ظاہری مفہوم پیش کر رہا ہے وہ شایانِ شان نہیں۔

*** توضیح و تشریح ***

یہ شعر نہ صرف اعلیٰ حضرت کے شایانِ شان بلکہ ان کے کمالِ عشق و محبت کا آئینہ دار ہے۔ بتقاضائے بشری ذہن انسانی اپنے مقصود و مطلوبِ حقیقی سے عارضی و لمحاتی طور پر ہٹ کر غیروں کی طرف بھی منتقل ہو جایا کرتا ہے۔ امامِ عشق و محبت کو ایک آن کے لیے بھی غیروں کا خیال اور ان کی طرف دھیان گوارا نہیں۔ اگر کسی لمحہ یہ عارضی صورت نمودار بھی ہوتی ہے تو جذبۂ عشق و محبت تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے محبوب و مطلوبِ حقیقی کے خیال میں ہمہ وقت مشغول و منہمک رہنے والا عاشق زار عارضی و لمحاتی [illegible] پر بھی اس کو گوارا نہیں کر پاتا اور عالمِ اضطراب میں اپنے بھرپور جذبۂ فدائیت کے ساتھ عرض کرتا ہے، فریاد کرتا ہے کہ "اے میرے محبوب، آقا و مولا! **میں** آپ پر قربان، میرے حالِ زار پر رحم فرمائیے، میری خبرگیری **فرمائیے** اور اپنے علاوہ غیروں کی طرف عارضی التفات سے **بھی باز رکھیے**۔ بس رات دن میں آپ کے خیال اور تصور ہی میں از [illegible] اور **محو و مستغرق** رہا کروں۔ دل و دماغ میں کسی لمحہ بھی غیروں کے خیال کا گزر نہ ہونے پائے۔

*** سوال ***

تجلّیِ شبِ اسریٰ ابھی سمٹ نہ چکا
کہ جب سے ویسے ہی **کوتل** ہیں سبزہائے فلک

شعر کی تشریح کے ساتھ **"چکا"** کا استعمال شعرا کے یہاں ملتا ہے؟

*** توضیح و تشریح ***

"چکنا" مصدر ہے، اس کا فعلِ ماضی "چکا" ہے، جس کا استعمال از روئے قواعد درست ہے اور یہ مکمل و ختم و تمام ہونے کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ استاذ الشعرا ذوق دہلوی کا ایک شعر ہے۔

پروانے سے کہتی تھی یہ شمع کہیں چل چک
ہے تجھ میں اگر جرأت، کیوں دیر لگائی ہے

یہاں "چک" کا استعمال بصیغہ امر ہوا ہے۔ شعر کا واضح مفہوم یہی ہے کہ حضور پُرنور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سفرِ معراج کے مبارک موقع پر شبِ معراج جو افلاک کی آرائش و زیبائش کی گئی تھی وہ اب تک ختم نہیں ہوئی ہے، بلکہ سبزہ ہائے فلک کوتل یعنی آراستہ و پیراستہ گھوڑے کی مانند اب تک موجود اور باقی ہیں۔

واضح ہو کہ "کوتل" اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو امیروں کی سواری کے آگے آراستہ و پیراستہ کر کے محض سجاوٹ اور دکھاوے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔

"سبزہ" جہاں شادابی و تازگی وغیرہ کے معنیٰ میں آتا ہے، وہیں سفیدی مائل بہ سیاہی گھوڑے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرہنگِ آصفیہ میں منجملہ دیگر معانی کے یہ معنیٰ بھی درج ہے۔

"سبزہ" وہ گھوڑا جس کی سفیدی مائل بہ سیاہی ہو۔

گویا (بطور استعارہ و کنایہ) افلاک کے سجے سجائے گھوڑے اب بھی موجود ہیں، ان کی آرائش و زیبائش، دلکشی و رعنائی، خوب صورتی و دل آویزی معراج کے دولھا کی جلوہ پاشی اور فیوض و برکات کے باعث اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

اسی مفہوم کو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے اپنی دوسری نعت پاک کے ایک شعر میں یوں ظاہر فرمایا ہے۔

رخشا یہ سبزۂ گردوں ہیں کوتل جس کے موکب کے
کوئی کیا لکھ سکے اس کی سواری کے تجمل کو

*** سوال ***

کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی
آنکھ والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

"آنکھوں والوں / آنکھ والوں / آنکھ والے" صحیح کیا ہے، دوسرا کیوں نہیں ہوگا؟

*** توضیح و تشریح ***

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

"وَلَمَّا جَاءَ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ."

ترجمہ: اور جب موسیٰ ہمارے وعدے پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام فرمایا، عرض کی اے رب میرے مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا، پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا، اسے پاش پاش کر دیا، اور موسیٰ گرا بے ہوش۔ پھر جب ہوش آیا، بولا پاکی ہے تجھے، میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ (کنز الایمان)

اور سورۂ والنجم میں ارشاد ہے: "مازاغ البصر وماطغیٰ".

آنکھ نہ کسی طرف پھری نہ حد سے آگے بڑھی - اس آیت کی تفسیر میں علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "اس میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے کمالِ قوت کا اظہار ہے کہ اس مقام میں جہاں عقلیں حیرت زدہ ہیں، آپ ثابت رہے۔ اور جس نور کا دیدار مقصود تھا اس سے بہرہ مند ہوئے۔ نہ مقصود کی دید سے آنکھ پھری نہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی طرح بے ہوش ہوئے، بلکہ اس مقامِ عظیم میں ثابت رہے۔"

مسلم شریف کی حدیث پاک ہے کہ "رأيت ربي بعيني و قلبي." "حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام تجلیاتِ ربانی کے مشاہدے کی بھی تاب نہ لا سکے اور غش کھا کر گر پڑے اور سرورِ انبیا محبوبِ کبریا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے شبِ معراج نہ صرف تجلیاتِ ربانی بلکہ ذاتِ ربانی کا مشاہدہ فرمایا اور: "مازاغ البصر وماطغیٰ". کی منزلِ استقامت پر فائز رہے۔ نہ انوارِ ذاتِ الٰہی کی دید سے آنکھ کسی دوسری جانب پھری اور نہ غش کھا کر گرے۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں اور ان احوال و کوائف کے تناظر میں کس کی آنکھوں کی ہمت و استقامت قابلِ ترجیح اور لائقِ توصیف ٹھہری۔ ظاہر ہے کہ سرورِ کائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ مقدسہ اور آپ کی تابِ دید ہی قابلِ ستائش ہوئی اور انھیں مبارک آنکھوں کی ہمت و استقامت پر سلام بھیجنا زیادہ قرینِ قیاس ٹھہرا۔

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اور دیگر انبیا و رسل علیہم الصلاۃ والسلام پر حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اولیت و فضیلت مسلم ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: "تلک الرسل فضلنا بعضهم علیٰ بعض". فاضل بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

سب سے اعلیٰ و اولیٰ ہمارا نبی
سب سے بالا و والا ہمارا نبی

اب "آنکھ والوں، آنکھوں والوں، آنکھ والے" کے تعلق سے کچھ معروضات پیش کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں پروفیسر منیر کعبی کے مندرجات نقل کر کے اپنا موقف واضح کروں: "اعلیٰ حضرت کا شعر "حدائقِ بخشش" میں اس طرح ہے۔

کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی
آنکھوں والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

جناب ناظم نے دوسرے مصرعے میں ترمیم کی ہے۔ اب مصرعِ ثانی خوانِ رحمت میں یوں ہے:

ع آنکھ والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

ناظم نے جو مصرعے متضمن کیے ہیں وہ اس قدر جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں کہ آپس میں بھی مربوط نہیں۔ اور اگر ان کے مصرعوں کو سامنے رکھیں تو (آنکھ والوں) ہی مناسب نظر آئے گا۔ اعلیٰ حضرت نے اگر "آنکھوں والوں" استعمال کیا ہے تو وہ بھی روزمرہ کے مطابق ہے اور اس میں احترام کی صورت موجود ہے۔ فقرا جب گدایانہ ملتجی ہوتے ہیں تو ان کا ایک مقولہ ہوتا ہے "آنکھوں والو! آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔" (علمی اردو لغت) - ایک اور بات یاد رکھنی لازم ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اہلِ زبان سے ہیں اور نہایت بلند عالم و فاضل اہلِ زبان۔

"آنکھوں والوں" اس لیے بھی ضروری ہے کہ جمع کا صیغہ ہے اور اشارہ دو عظیم اولو العزم رسولانِ کرام علیہما الصلاۃ والسلام کی جانب۔ دونوں لفظوں کو جمع کی صورت میں لانا خود جناب ناظم کے یہاں مستعمل ہے۔ دیکھیے! حفیظ کے لیے لائے گئے القاب میں "نعوت نگاراں" یہاں قائد نعوت نگاراں درست تھا مگر انھوں نے "نعوت نگاروں" لکھا ہے۔ جناب شمس بریلوی نے جو "حدائقِ بخشش" ۱۹۷۶ء میں مرتب کر کے مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی کی جانب سے شائع کی، اس میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے مصرعے کو علیٰ حالہ قائم

رکنِ مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ، گھوسی، مئو

رکھا، مگر تضمین کرتے وقت اس مصرع کو تبدیل کر دیا اور کہا کہ "آنکھ والے کی ہمت پہ لاکھوں سلام" اور "آنکھ والے" انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مقدس کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا۔ حالاں کہ مضمون کا تسلسل صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام تک ہی نہیں۔ مشاہدۂ انوارِ الٰہی میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس واطہر بھی شریک ہے جس کی سمت مضمون کے سیاق وسباق سے بتصریح اظہار موجود ہے۔ تحریف کے بعد دو تراکیب سامنے آتی ہیں "آنکھ والے"۔ اس میں ایک طرف شوخی ہے تو دوسری طرف تکلف کا پہلو نکلتا ہے جو ادب کے خلاف ہے۔ اور "آنکھ والوں" پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ شاید اس سے ایک آنکھ والے مراد ہیں اور یہ بھی توہین ہے۔"

پروفیسر منیر کعبی کا یہ قول کہ "آنکھ والے میں ایک طرف شوخی اور دوسری طرف تکلف کا پہلو نکلتا ہے جو ادب کے خلاف ہے۔ اور "آنکھ والوں" پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ شاید اس سے ایک آنکھ والے مراد ہیں اور یہ بھی توہین ہے۔"

مجھے اس میں کلام ہے آنکھ بصیغۂ واحد بمعنیٰ جمع کثیر الاستعمال ہے اور نہ ان میں اہانت ہے نہ شوخی، نہ یک چشمی کا عیب، جب تک کوئی قرینہ اس پر دال نہ ہو۔ خود حدیث پاک میں بصیغۂ واحد بمعنیٰ جمع مستعمل ہے اور ہر عیب ونقص سے پاک ومنزّہ ہے۔ مسلم شریف کی **مرفوع حدیث** ہے کہ: "رأیت ربی بعینی و قلبی" فارسی میں بھی **چشم** بمعنیٰ جمع کثیر الاستعمال ہے۔

چشم بکشا زلف بہ شکن جانِ من   چشم ما روشن ودل ما شاد

اب آیئے اردو زبان میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں آنکھ کا استعمال بلا تکلف بطور جمع واسم جنس کیا گیا ہے اور کسی کو ان میں یک چشمی اور دیگر نقائص کا احساس تک نہیں ہوتا۔

آنکھ محوِ جلوۂ دیدار، دل پر جوشِ دید
لب پہ شکرِ بخششِ ساقی، پیالی ہاتھ میں

آہ وہ آنکھ کہ محرومِ تمنا ہی رہی
ہائے وہ دل جو ترے در سے پُر ارمان گیا

کل تو دیدار کا دن اور یہاں
آنکھ بے کار ہے کیا ہونا ہے

آنکھ کھولو غم زدو، دیکھو وہ گریاں آئے ہیں
لوحِ دل سے نقشِ غم کو اب مٹائے جائیں گے

آنکھ سے کاجل صاف چرا لیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

اب دوسرے مستند شعرا کے کلام میں آنکھ کا استعمال بصورتِ جمع واسم جنس ملاحظہ فرمایئے۔

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے   (سودا)

لہو کے دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے   (غالب)

تجھ پہ پڑتی ہے یار سب کی آنکھ
چشم بد دور ہے غضب کی آنکھ   (داغ)

بھر گیا دامنِ نظارہ گلِ نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تو نے ادھر دیکھ لیا   (آتش)

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی   (اقبال)

ان تمام امثال ونظائر کی روشنی میں "آنکھ والے" کا استعمال غلط نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ اس کے استعمال میں کسی عیب ونقص کا شبہہ کیا جا سکتا ہے جب تک کہ کوئی قرینہ دال نہ ہو۔ بایں ہمہ کمالِ احتیاط اور ہر قسم کے ریب وشک سے پاک، ادب واحترام سے مملو "آنکھوں والے" کا استعمال زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، یعنی: "آنکھوں والے کی ہمت پہ لاکھوں سلام"

"آنکھوں والوں" میں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی ذاتِ گرامی اور ان کی تابِ دید کو شامل کر کے سلام بھیجنے کی بات کی جائے تو حضورِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی خصوصیت اور امتیازی صفت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر دیدار کی ہمت کا نہ پایا جانا اور نورِ الٰہی کے دیدار کی تاب نہ لا کر غش کھا کر گر پڑنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ فرمانا اور رویتِ ذاتِ باری تعالیٰ کی ہمت واستقامت کا پایا جانا امرِ واقعہ ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

معنیِ قدرِ مقصدِ ما طغیٰ
نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام

تبارک اللہ شان تیری، تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہاں تو وہ جوشِ "لن ترانی" کہاں تقاضے وصال کے تھے؟

نہ عرش ایمن نہ انی ذاہب میں میہمانی ہے
نہ لفظ ادن یا احمد، نصیب لن ترانی ہے

★★★ سوال ★★★

حورِ جناں ستم کیا، طیبِ نظر میں پھر گیا
چھیڑ کے پردۂ حجاز، دیس کی چیز گائی کیوں

خصوصاً مخطوط اشعار کی تشریح؟

★★★ توضیح وتشریح ★★★

تشریح الفاظ:-

حورِ جناں — بہشت کی خوب صورت عورتیں۔
ستم کیا — عجیب کام کیا، بڑھ کا کام کیا۔
پھر گیا — گردش کرنے لگا، گھومنے لگا
پردۂ — چلمن، چمک، اوٹ، مقاماتِ موسیقی جیسے پردہ عشاق
حجاز — ملک عرب میں ایک مشہور ومقدس مقام اور مقاماتِ موسیقی میں سے ایک مقام۔
دیس — ملک، علاقہ، ایک راگ جو نصف شب کے بعد گایا جاتا ہے۔
چیز — شے، اسباب، جنس، زیور، حقیقت، گیت، راگ، ٹھمری، غزل وغیرہ۔   (ماخوذ از فرہنگ آصفیہ)

بہارِ شریعت (جنت کا بیان) حصہ اول، ص: ۵۱-۵۲ پر مذکور ہے کہ "جب کوئی بندہ جنت میں جائے گا تو اس کے سرہانے اور پائنتی دو حوریں نہایت اچھی آواز سے گائیں گی، مگر ان کا یہ گانا، یہ شیطانی مزامیر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ عز وجل کی حمدِ پاک ہو گا۔ وہ ایسی خوش گلو ہوں گی کہ مخلوق نے ایسی آواز کبھی نہ سنی ہو گی اور یہ بھی گائیں گی کہ ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، کبھی نہ مریں گی، ہم چین والیاں ہیں، کبھی تکلیف میں نہ پڑیں گی، ہم راضی ہیں کبھی ناراض نہ ہوں گی، مبارک اس کے لیے جو ہمارا اور ہم اس کے ہیں۔"

"فھم فی روضۃ یحبرون۔" (سورۂ روم پ: ۲۱، رکوع: ۱۴، آیت: ۱۵)

ترجمہ: باغ کی کیاریوں میں ان کی خاطر داری ہو گی۔

حضرت امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ "اس میں اسی سماع کا ذکر کیا گیا ہے جو اہلِ جنت بہشت کی خوب صورت حوروں کی دل کش اور مترنم آوازوں میں سنیں گے کہ وہ گا رہی ہوں گی جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: ہم ہمیشہ زندہ رہنے والیاں ہیں، ہمیں کبھی موت نہیں آئے گی، سدا نرم ونازک اور تر وتازہ رہیں گی، ہم پر کبھی بڑھاپے کی سختی نہیں آئے گی۔" (ترجمہ کتاب اللمع، ص: ۴۵۴)

ان روایات سے ثابت ہے کہ بندۂ مومن جب جنت میں داخل ہو گا تو اس کے اکرام واعزاز اور دل بستگی کے لیے حوریں نشاط انگیز وطرب آگیں نغمے گائیں گی اور یہ نغمات حجازی لے میں یعنی عربی زبان میں گائیں گی جو جنت کی زبان ہے اور حجاز مقدس کی بھی اور یہ حوریں فردوس یعنی اپنے علاقہ (جنت) کی اور خود اپنی خوبیاں اپنے دل کش نغموں کے ذریعہ بیان کریں گی۔ نغموں کے اس حجازی رنگ وآہنگ اور حوروں کی اپنی اور جنت کی بہاروں کی تعریف وتوصیف کے باعث شاعر جو عاشقِ رسول ہے اور رسول کے دیار اور گلی کوچے سے بے پناہ قلبی لگاؤ اور الفت ومحبت رکھتا ہے، اس کی نظروں میں مدینہ طیبہ کا نقشہ پھر جائے گا۔ اس کے حسین ودل کش مناظر نظروں کے سامنے گھومنے لگیں گے، کیوں کہ محبت کی نفسیات یہ ہے کہ۔

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سر گرمِ نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

"حورِ جناں ستم کیا" پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ جنت تو عیش ونشاط کی جگہ ہے، وہاں پر ظلم وستم کا کیا معنیٰ؟ — پھر حورانِ بہشت کی طرف ستم کا انتساب کیوں کر درست ہے؟ — تو میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ "ستم" جہاں ظلم وتعدی اور بیداد وجفا کے معنیٰ میں آتا ہے، وہیں غضب اور چالاک کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ محبت اور پیار سے بھی معشوق شوخ وطناز اور ستم گر کہا جاتا ہے۔

ستم کرنا ظلم وبیداد کرنے کے علاوہ غضب کرنا اور کوئی نئی عجیب بات کہنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ اور ستم کیا، بطور محاورہ عجیب کام کیا، بڑھ کا کام کیا کے معنیٰ ومفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ لہٰذا لفظ "ستم" کا استعمال اگر غضب، عجیب بات کہنے، ناز وادا اور شوخی کرنے کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے اور اس کا انتساب حوروں کی طرف کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

★★★ سوال ★★★

ہائے رے ذوقِ بے خودی، دل جو سنبھلنے سا لگا
چھک کے مہک میں پھولوں کی گرنے لگی صبا کی یوں

پورے شعر کا مفہوم وضاحت طلب ہے؟

*** توضیح و تشریح ***

"چھکنا" مست و سرشار ہونے، بے قابو و بے اختیار ہونے کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ میر تقی میر کا شعر ہے۔

کچھ نہ پوچھو مہک رہے ہیں ہم
عشق کی مے سے چھک رہے ہیں ہم

مفہوم شعر:- بے خودی و سرشاری کی لذت و کیفیت کا کیا کہنا، اگر دل کبھی سنبھلنے سا لگتا ہے یعنی بے خودی و سرشاری کی کیفیت کچھ کم ہونے لگتی ہے تو صبا پھولوں کی خوشبو سے مست و سرشار ہوکر کہیں رُکتی نہیں، بلکہ افتاں و خیزاں ہرطرف چلتی رہتی ہے۔ اپنی افتادگی و بے خودی سے بتارہی ہے کہ سنبھلنے اور ہُشیار رہنے میں وہ مزا، وہ کیف و نشاط اور وہ بات نہیں جو عشق و محبت میں بے خود و سرشار ہونے میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ عشق رسول میں ہمہ وقت بے خود و سرشار رہنا ہی اصل کیف و نشاط اور مدعائے حیات ہے۔

*** سوال ***

غفلتِ شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفل شیر خوار
کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہائی کیوں

مفہوم شعر؟

*** توضیح و تشریح ***

اس پورے شعر میں سب سے زیادہ تشریح طلب لفظ "بہائی" ہے۔ آیئے سب سے پہلے لفظ "بہائی" کی تشریح ملاحظہ فرمایئے:

"بہائی" — اہل ہند کے اعتقاد میں ایک روح ہے جو ننھے بچوں کو کھلایا کرتی ہے، جب وہ ان کے کان میں کچھ کہتی ہے کہ تیری ماں مرگئی تو بچے رونے کی صورت بنالیتے ہیں، یعنی بسورنے لگتے ہیں اور جب وہ بیان کرتی ہے کہ نہیں جیتی ہے تو ہنسی خوشی کی صورت بنالیتے ہیں — درحقیقت یہ خواب ہوتا ہے جو بچے دیکھ کر کبھی سوتے میں ہنسنے کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں کبھی رونے کی۔

اگرچہ عوام اسے بے حیائی بولتے ہیں مگر بعض شاعروں مثلاً قلق وغیرہ نے بھی اس میں دھوکا کھایا ہے۔

روتے روتے جو نیند آئی تھی
بے حیائی اسے ہنساتی تھی

مگر شیخ امداد علی بحرؔ نے از روئے تلفظ و املا اپنے شعر میں بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔

افسوس بہائی نے بھی مجھ کو
طفلی میں نہ عشق کی خبر کی (فرہنگ آصفیہ)

اس تشریح کے بعد اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے شعر۔

غفلتِ شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفل شیر خوار
کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہائی کیوں

بوڑھے اور جوان کی غفلت و بے خبری یعنی اپنے حقوق و فرائض کی ادائیگی سے غفلت، لاپرواہی اور عواقب سے بے خبری پر جب کہ وہ صاحب عقل و شعور ہیں۔ طفل شیر خوار جو ابھی صاحب عقل و شعور بھی نہیں، ہنستے ہیں۔ اور شیرخوار بچوں کو گدگدا کر ہنسنے اور خندہ زنی پر بہائی نے بے سود اور عبث نہیں اکسایا اور آمادہ کیا ہے، بلکہ شیخ و شاب کے صاحب فہم و ادراک ہونے کے باوجود اپنے فرائض و حقوق بندگی کی ادائیگی سے غفلت کی بنا پر ہنسنے پر مجبور کیا ہے اور یہ ہنسنا بطورِ محاورہ طنز کرنے، تمسخر اڑانے، مذاق اڑانے کے مفہوم میں اور زیادہ بلیغ اور بامعنیٰ ہو جاتا ہے، گویا یہ شعر تلمیحاتی پس منظر میں درسِ عبرت بھی ہے اور حسن تعلیل کا خوب صورت نمونہ بھی۔ یا — در اصل بہائی کے گدگدانے کے سبب طفل شیرخوار کی ہنسی نہیں بلکہ خواب میں ان کا ہنسنا باقتضائے فطرت ہے اور اسی کو غفلتِ شیخ و شاب پر ہنسنے کی علت قرار دینا بطور حسن تعلیل ہے۔ حسن تعلیل وہ صنعت ہے جس میں حقیقۃً اگرچہ وہ علت نہیں ہوتی لیکن بطور مجاز اس کو اس کی علت قرار دیا جاتا ہے۔

*** سوال ***

حسرتِ نو کا سانحہ سنتے ہی دل بگڑ گیا
ایسے مریض کو رضاؔ مرگِ جواں سنائی کیوں

مفہوم شعر؟

*** توضیح و تشریح ***

عاشق صادق کو دیارِ حبیب میں پہنچنے کے وقت سکونت دوام کی تمنا تھی، مگر یہ جان کروہ بیمار و حسرت زدہ ہوگیا کہ ایسا تیر النصیب نہیں چند ایام گزرنے کے بعد یہ آرزو ہوئی کہ ہمیشگی اور دوام نہیں تو کچھ دن اور قیام کا موقع نصیب ہو جائے، لیکن کسی نے خبر دی کہ اس کی بھی گنجائش نہیں، بس آج کل میں تمھیں چلے جانا ہے۔ اب اس جوان اور تازہ آرزو کا بھی دم گھٹ گیا اور حسرتِ تازہ کے زخم سے دل کی حالت بالکل غیر ہوگئی کیوں کہ ایک بیمار کو مرگِ جواں کی خبر سنادی گئی، جس سے اس کی آس بالکل ٹوٹ گئی اور رہا سہا سکون و قرار بھی رخصت ہوگیا۔ ایسی حسرت انگیز اور جاں کاہ خبر کا تو نہ سنانا ہی بہتر تھا۔ ☆☆☆

نقد و نظر

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے

نام کتاب : **ضعیف اور موضوع حدیث کا علمی و فنی جائزہ**
مصنف : ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ
مترجم : مولانا محمد طفیل احمد مصباحی
صفحات : (۶۴) سن اشاعت: ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء
ناشر : الہادی پبلی کیشنز، مومن پور روڈ، خضر پور، کولکاتا
مبصر : محمد ساجد رضا مصباحی

ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ (۱۳۰۳ھ - ۱۳۸۲ھ) مجدد اعظم امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ - ۱۳۴۰ھ) کے عزیز ترین تلمیذ اور جماعتِ اہل سنت کے جلیل القدر عالمِ دین تھے، مختلف علوم و فنون میں گہری بصیرت نے آپ کو مرجعِ عوام و خواص بنادیا تھا، آپ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور دینِ حق کی تائید و حمایت میں مصروف رہے۔ جامعہ منظر اسلام بریلی شریف، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مدرسہ بحر العلوم کٹیہار جیسے اہم اداروں کے مسندِ تدریس پر جلوہ افراز ہو کر ہزاروں تشنگانِ علوم و فنون کو اپنے بحرِ علم سے سیراب فرمایا۔ دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت اور رد و مناظرہ جیسی اہم ترین مصروفیات کے باوجود آپ کے زر نگار قلم سے ۷۰/ سے زائد علمی و فنی تصانیف بھی معرضِ وجود میں آئیں۔ آپ کی تصنیفات میں ایک شاہ کار تصنیف "الجامع الرضوی" بھی ہے جو "صحیح البہاری" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ملک العلما نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں فقہی ابواب کے مطابق احناف کی مستدل احادیث کو جمع فرمایا ہے۔ "صحیح البہاری" فقہ حنفی کی مستدل احادیث پر مشتمل اپنی نوعیت کی منفرد اور واحد کتاب ہے۔

ملک العلما علیہ الرحمۃ والرضوان نے "صحیح البہاری" کے لیے ایک وقیع اور جامع مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں احادیثِ نبویہ کے مراتب و احکام، ضعیف احادیث کے مختلف درجات، موضوع حدیث کی تعریف و تحقیق، ضعیف اور موضوع حدیث میں فرق اور احادیث کی مختلف اقسام سے ثابت ہونے والے احکام پر نہایت عالمانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی گراں قدر علمی و فنی مقدمے کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ ہے، مترجم ہیں مولانا طفیل احمد مصباحی جو خیر سے اب ماہ نامہ اشرفیہ کے سب ایڈیٹر بھی ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں مولانا موصوف کا شمار الجامعۃ الاشرفیہ کے باذوق، حساس اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں متعدد بار تحریری انعامی مقابلوں میں اول انعام اور ایوارڈ سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔ تحقیق و مطالعہ اور تحریر و قلم کے شوق نے ہی انھیں اس اہم کام پر آمادہ کیا۔ ترجمے کا کام مستقل لکھنے سے زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے، کیوں کہ ترجمہ کسی لفظ کا صرف لغوی معنیٰ بتا دینے کا نام نہیں بلکہ ایک زبان کے مواقعِ اطلاقات، محاورات، استعارات اور تشبیہات پر گہری نظر رکھتے ہوئے اس کا صحیح مفہوم متعین کر کے پوری دیانت داری کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کر دینے کا نام ہے۔ اس لیے ترجمے کا حق وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو دونوں زبانوں کے رموز و اسرار سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو اور ذوقِ لطیف کا بھی حامل ہو۔ مولانا طفیل احمد مصباحی کے اس ترجمے کے مطالعے کے بعد میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا موصوف نے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔

ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ کا یہ مقدمہ ۲۳/ افادات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے یہ مقدمہ حدیث کی امہات کتب کے حوالوں کی روشنی میں لکھا ہے مگر اس کا خاص ماخذ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے وہ علمی افادات ہیں جنھیں مصنف نے "الافادات الرضویہ" کے نام سے مرتب فرمایا تھا، جیسا کہ خود ہی مقدمے کے اخیر میں اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"وھذا نھر اصغر من البحر الاکبر من بحار علوم سیدی و شیخی (الامام احمد رضا البریلوی قدس سرہ) نفعنا ببرکاتہ فی الدنیا والآخرۃ." (مقدمہ صحیح البہاری، ص:۲۶)

علامہ بہاری نے اپنے اس مقدمے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں حدیثِ ضعیف کو موضوعِ سخن بنایا ہے، جب کہ دوسرے حصے میں موضوع حدیث اور اس کے متعلقات پر تحقیق کے

جوہر لٹائے ہیں۔ مقدمے کے ابتدائی صفحات میں کتبِ حدیث کے اقسام، احادیث کے مراتب اور مراسیل کے قبول میں صحابہ وتابعین کے مسلک پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ضعیف احادیث باتفاقِ جمہور بابِ فضائل میں مقبول و معتبر ہیں، امام اجل شیخ العلماوالعارفین سیدی ابو طالب محمد علی بن مکی قدس سرہ اپنی کتاب "قوت القلوب فی معاملة المحبوب" میں فرماتے ہیں:

"الاحادیث فی فضائل الاعمال و تفضیل الاصحاب متقبلة محتملة علی کل حال مقاطیعها و مراسیلها لا تعارض ولا ترد کذٰلک کان السلف یفعلون."

(بحوالہ فتاویٰ رضویہ. ج:۲، ص:۴۰۷)

یعنی فضائل اعمال اور تفضیل صحابۂ کرام میں حدیثیں کیسی ہی ہوں ہر حال میں مقبول ہیں، مقطوع ہوں خواہ مرسل، نہ ان کی مخالفت کی جائے نہ انھیں رد کریں۔ ائمہ سلف کا یہی طریقہ تھا۔

لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اکابرین امت کی مخالفت اور ضد وعناد میں ہر بات میں صحیح حدیث ہی ضروری سمجھتے ہیں، ان کے یہاں فضائل و معجزات کے لیے بھی صحیح حدیث کا ہونا ضروری ہے۔

ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنے اس مقدمے میں ناقابلِ تردید دلائل، معتمد علما کے اقوال اور اصولِ حدیث کی مستند کتابوں کی عبارتوں کی روشنی میں واضح فرمایا ہے کہ بابِ فضائل میں ضعیف احادیث ہی کافی ہیں، انھوں نے اپنے اس موقف پر متعدد عقلی دلائل بھی پیش فرمائے ہیں۔ ضعیف احادیث کے تعلق سے ان کی یہ تحقیق بھی لائقِ تحسین ہے کہ کشف و تجربہ سے بھی حدیثِ ضعیف، قوی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اہل علم کا عمل بھی حدیثِ ضعیف کو قوت پہنچاتا ہے۔

حدیث کی عدم صحت اور موضوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کسی حدیث کے صحیح نہ ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ موضوع و باطل ہے۔ لیکن بعض نام نہاد محققین اپنی علمی سطحیت کے سبب غیر صحیح احادیث کو موضوعات کے خانے میں رکھ کر اپنے عقائد و نظریات کی عمارت کھڑی کرتے ہیں، جیسا کہ سیرۃ النبی کے مؤلفین شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی کی گل افشانیوں کا مطالعہ کر کے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ملک العلما علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنے اس مقدمے میں نہایت مستحکم دلائل سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ حدیث کا صحیح نہ ہونا اس کے موضوع ہونے کو مستلزم نہیں۔ آپ نے علم وتحقیق کی روشنی میں اس بات کی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ حدیث منقطع، مضطرب، منکر، متروک اور مبہم کو موضوع کہنا غلط اور قوانین اصولِ حدیث کی صریح خلاف ورزی ہے۔

ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ کا یہ پورا مقدمہ اسی طرح کے متعدد بیش بہا علمی مباحث پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مختصر عبارتوں کے اندر مفاہیم و معانی کے بیش بہا خزانے سمو دیے ہیں۔ فاضل مترجم نے حسبِ ضرورت متعدد مقامات پر حواشی بھی لگا دیے ہیں اور ضروری اصطلاحات کی تعریف و تشریح بھی کر دی ہے جس کی وجہ سے **استفادہ بہت حد تک** آسان ہو گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں عرضِ مترجم کے علاوہ الجامعۃ الاشرفیہ کے شیخ الحدیث محدث جلیل حضرت علامہ عبدالشکور مصباحی دام ظلہ العالی، حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی مصباحی اور نازشِ لوح وقلم حضرت مولانا مبارک حسین مصباحی کے دعائیہ کلمات بھی شامل ہیں۔ ان جلیل القدر شخصیتوں کے تاثرات نے اس ترجمے کو سند اعتبار فراہم کرنے کے ساتھ اس کی اہمیت وافادیت میں بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔

کتاب کی طباعت، کتابت، کاغذ اور گیٹ اپ میں خوش سلیقگی صاف جھلکتی ہے۔ رموز اوقاف مثلاً کوما، فل اسٹاپ، کولن، سیمی کولن اور ڈیش وغیرہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر کمپوزنگ کی غلطیاں ضرور در آئی ہیں لیکن اتنی ساری خوبیوں کے ساتھ انھیں برداشت کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل علم وبصیرت اس ترجمے کو استحسان کی نظر سے دیکھیں گے اور مولانا طفیل احمد مصباحی آئندہ بھی اپنے رشحاتِ قلم سے قارئین کو مستفید فرماتے رہیں گے۔

☆☆☆

منظومات

روشنی

ہے یقیناً ثنائے خدا روشنی
پھر ہے ذکرِ شہِ دوسرا روشنی

ہر اندھیرا ہدایت کا محتاج ہے
آ گئے بن کے شاہِ ہُدیٰ روشنی

ماہ و انجم کی ضَو، کہکشاں کی چمک
یعنی سرکار کا نقشِ پا روشنی

اُن کی پرچھائیں مہکی ہوئی چاندنی
چاند تلوے سے کچھ پا گیا روشنی

مہر و مہ اُن کی صورت سے روشن ہوئے
اُن کی سیرت کی ہر اک ادا روشنی

اُن کا سونا بھی نورٌ علیٰ نور ہے
اُن کا سب کے لیے جاگنا روشنی

گیسوئے پاک واللیل کی دل کشی
روئے اطہر سے ہے والضحیٰ روشنی

بھیک اتنی ملی رُخ سے خورشید کو
ساری دنیا کو ہے بانٹتا روشنی

تیرگی بے وفائی کی تحریک ہے
اُن کے صدقے میں ہے باوفا روشنی

عشق میں اُن کے بیکلؔ ہر اک سانس ہے
از ازل تا ابد سلسلہ روشنی

بیکل اتساہی

نہیں ھے کوئی امام ان کا

وہ شاہ زادے ہیں آمنہ کے، ہے نام خیر الانام اُن کا
دلوں میں سب کے بسے ہوئے ہیں، ہے شہر طیبہ قیام اُن کا

حبیبِ ربِ کریم ہیں وہ، عمیم ہیں وہ عظیم ہیں وہ
امام کون و مکاں وہی ہیں، نہیں ہے کوئی امام اُن کا

گلوں کی شاخوں کا چمکے چہرہ، نفس نفس خوشبوؤں کا پہرا
انھیں کا صدقہ چمن سنہرا، شگفتگی اہتمام اُن کا

وہ شق ہوا چاند آسماں پر، زمیں پہ چرچا ہر اک زباں پر
سمجھ نہ پائے گا زندگی بھر کوئی منافق مقام اُن کا

یہ سوکھا دریا اُبل پڑا ہے، تمام صحرا اچھل پڑا ہے
یقین رب پر، نبی پہ ایماں، جری ہے کتنا غلام اُن کا

یہ حرف ولفظ وبیان میرا، حسیں شعورِ زبان میرا
جو لکھ رہا ہوں ہے لکھا اُن کا، جو پڑھ رہا ہوں کلام اُن کا

حیات میری ہے نعت گوئی، اساس اس کے سوا نہ کوئی
خدایا میرے لبوں کی زینت رہے درود و سلام ان کا

انھیں کا صدقہ ہیں آنکھیں بیکلؔ، ہے جن میں عشق ووفا کی جھل جھل
انھیں سے بینائیاں مکمل، ہے اُن پہ لطفِ تمام اُن کا

بیکل اتساہی بلرام پوری

رثائی رباعیات

اللہ کے دربار میں ہے رُتبہ بڑا
سرکارِ مدینہ بھی سمجھتے ہیں بھلا
تسلیم زمانے کو ہے اُن کی عظمت
حسنین کریمین ہیں جن کے آقا

آئے تھے خدا والوں پہ کب یہ دن رات
شبیر کے بچوں نے سہے جو صدمات
افواجِ یزیدی کو ڈبو کیوں نہ دیا
شرمندہ ہے اِس جرم پہ دریائے فرات

دونوں ہی تھے بچپن سے سعادت آثار
دونوں کا تھا واللہ مثالی کردار
زہرا و علی کے یہ مقدس فرزند
دونوں ہیں جوانانِ جناں کے سردار

پردیس میں کچھ قید ہوئے کچھ مقتول
یہ دیکھ کے تڑپی تھی بہت روحِ بتول
انصاف تھا اُس وقت وہاں اور نہ عدل
صحرا میں لُٹا قافلۂ آلِ رسول

اے حضرتِ انسان و اجنّہ کے امام
صابرؔ تو ہے سرکار کا بے دام غلام
کرتے ہیں ملائک بھی محبت سے پیش
قربانیِ حضرت کو عقیدت کا سلام

ڈاکٹر صابر سنبھلی

الٰہی مرا نورِ بصیرت عام کر دے

سلسلہ ٹوٹے نہیں

یہ ہے میرا وطن

یوم مفتی اعظم ہند

مبارک حسین مصباحی

۳۱؍ دسمبر ۲۰۰۹ء کی یہ ایک خمار آلود ٹھٹھری ہوئی شام تھی، کہرے کی دبیز چادر نے جامعہ اشرفیہ کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ جامعہ کی شاہ راہوں پر لگی لائٹیں کسی طرح اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھیں، مگر طلبہ کے ہاسٹلوں میں عجیب گہما گہمی کا عالم تھا۔ جماعتِ سابعہ کے جواں سال طلبہ پر کسی سردی گرمی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ عزیزی ہاسٹل کے سامنے والے پارک کو پوری طرح ایک ہال میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وسیع پنڈال کا داخلی حصہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ قدرے وسیع اور بلند اسٹیج اپنے معزز مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ طلبہ کی ایک ٹیم جب ہمیں لے کر اسٹیج کی جانب بڑھی تو مجمع شوق میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ دراصل اہم تقریبات میں بیرونی خطیب سے پہلے ماحول ساز گار کرنے کے لیے طلبہ ہمارا ہی استعمال کرتے ہیں اور ہم بہ دل و جان استعمال بھی ہوتے رہتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ یہ پروگرام صرف جماعتِ سابعہ کا نہیں بلکہ یہ سالانہ تقریب اپنے عظیم محسن کی بارگاہ میں جامعہ اشرفیہ کا مشترکہ خراج ہو جاتا ہے۔ اس پروگرام سے بریلی اور مبارک پور کے رشتوں کو تازگی ملتی ہے، تاریخ کے پٹ کھلتے ہیں، مفتی اعظم ہند کی نوازشِ خسروانہ کے کردار دہرائے جاتے ہیں، رضویات و نوریات پر فرزندانِ اشرفیہ کو مزید کام کرنے کے لیے مہمیز کیا جاتا ہے۔

اسٹیج پر پہلے ہی سے کچھ اساتذہ موجود تھے۔ ماہرین نے اسٹیج کو حجلۂ عروسی کی طرح سجایا تھا۔ اس میں ظاہری آرائش سے زیادہ اخلاص کی چاندنی کا حسن بے نقاب ہو گیا تھا۔ حدِ نظر کرسیوں پر بیٹھے طلبہ اپنی سلیقہ شعاری کا احساس دلا رہے تھے۔ شدید سردی کے باوجود ان کی اضطرابی کیفیت، ان کی بلند ذوقی کا اعلان کر رہی تھی۔ نعتوں اور منقبتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور ہم اسٹیج پر بیٹھے بٹھائے دو عشرے پیچھے چلے گئے، جب نہ جامعہ میں جنریٹر کا اہتمام تھا اور نہ یہ خوش نما پارک، نہ پکی سڑکیں تھیں اور نہ لکھنے لکھانے کی یہ گرم بازاری۔ بنا پلاسٹر کے ہاسٹل کی راہ داریاں بھی اوبڑ کھابڑ تھیں، مگر جامعہ کا تعلیمی اور فکری نظام اس وقت بھی صراطِ مستقیم پر گامزن تھا اور آج بھی اسی جذبۂ جنوں خیز کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ جامعہ اشرفیہ کے مجموعی نظامِ فکر کی انگلیاں ہمیشہ بدلتے حالات کی نبض پر رہی ہیں۔

یومِ مفتی اعظم ہند کا یہ حسین منظر دیکھ کر مجھے اپنا عہدِ طالب علمی یاد آ گیا، یہ کوئی ۱۹۹۰ء یا ۸۹ء کی بات ہو گی، جماعتِ سابعہ کے کچھ بلند حوصلہ طلبہ نے ایک میٹنگ کی، جس کی پیشوائی مولانا ذو الفقار خاں رام پوری کر رہے تھے۔ بہ اعتبارِ جماعت ہم ان سے ایک سال سینیر تھے باقی تمام امور میں وہ ہم سے سینیر تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے پایا کہ جماعتِ سابعہ کے زیرِ اہتمام "یومِ مفتی اعظم ہند" کا انعقاد کیا جائے۔ طلبہ کے مابین تحریری اور تقریری مسابقے کے لیے عنوانات آویزاں کر دیے گئے۔ مفتی زاہد علی سلامی بھی اتفاق سے ان دنوں شعبۂ تحقیق میں زیرِ تعلیم تھے۔ ہم وطنی اور ہم مزاجی کے نتیجے میں ہم لوگوں کی محفلیں بزمِ طنز و مزاح سے عبارت ہوتی تھیں، ویسے بھی غم غلط کرنے کے لیے چند ساعت صحبتے بہ سلامی نسخہ کیمیا ہوتی ہے۔ سلامی صاحب جب مولانا ذو الفقار کو اپنے مخصوص لہجے میں "خان صاحب" کہہ کر پکارتے تھے تو خان صاحب کے پورے وجود پر تازگی اور سرشاری کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ لفظ "خان صاحب" سے ان کی پیشانی پر علامہ اقبال کی "خودی" ہویدا ہی نہیں بلکہ مجسم ہو جاتی تھی۔ خیر خان صاحب کی قیادت میں جماعتِ سابعہ نے بڑے شوق سے یوم مفتی اعظم ہند کا اہتمام کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، اس روایت کے تسلسل میں کبھی ناغہ نہیں ہوا، بلکہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا رہا اس کے نظم و نسق اور حسنِ اہتمام میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

چند سال سے اس تقریب میں "توسیعی خطبہ" کا بھی اضافہ ہو گیا ہے جس میں ہر سال طے شدہ موضوع پر کسی بلند فکر عالم یا کسی دانش ور پروفیسر کا خطاب ہوتا ہے۔ سنی مدارس کی دنیا میں اس بدعتِ حسنہ کے موجد کی حیثیت سے ہمارا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ علمی سلسلہ بھی اپنے یوم آغاز سے آج تک جاری ہے۔ چند سالہ مدت میں جن حضرات کے خطابات ہوئے ہیں، ان کے نام اس طرح ہیں— معروف فکشن نگار حضرت سید محمد اشرف مارہروی، ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم برکاتی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، پروفیسر نجم الہدیٰ پٹنہ، ڈاکٹر عرشی خان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا یٰسین اختر مصباحی۔

ان خطبات سے طلبہ اور اساتذہ نے استفادہ کیا۔ عصری اور دینی علوم کے ماہرین میں ربطِ باہم کی راہیں نکلیں، جامعہ اشرفیہ کا مشاہداتی تاثر

یونیورسٹیوں تک پہنچا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر دیگر مدارس کے طلبہ اور اساتذہ بھی اس رخ پر قدم بڑھائیں۔

مفتی اعظم ہند علامہ شاہ مصطفیٰ رضا بریلوی خاندانی وجاہتوں کے ساتھ ذاتی فضائل و کمالات کے بھی بحرِ ناپیدا کنار تھے۔ وہ اپنے والدِ گرامی امام احمد رضا قدس سرہ کے حقیقی وارث تھے، ان کے فکر و نظر کے مبلغ و ترجمان تھے، شریعت و طریقت کے مسائل میں مرجعِ عوام و خواص تھے، جہانِ سنیت میں ان کی شخصیت حَکَم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جماعتی درد رکھتے تھے، وہ مشربی زعمِ تعصب کی بوالعجبیوں پر جماعتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے، شخصی خانقاہ اور شخصی ادارے سے بلند ہو کر سوچتے تھے۔ انھیں شخصیت سے زیادہ جماعتی بالادستی عزیز تھی۔ اس لیے ہر ادارہ، ہر خانقاہ اور ہر تحریک ان کا احترام کرتی تھی، ان کی باتوں پر سرِ تسلیم خم کرتی تھی اور سچ یہی ہے کہ شخصیت کی شناخت جماعت کے حوالے سے ہونا چاہیے نہ کہ جماعت کی شناخت شخصیت سے۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور خاکِ ہند میں اہلِ سنت کی سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ اس کی وسیع خدمات کا دائرہ اب ایک صدی کو محیط ہو رہا ہے۔ اکابرِ اہلِ سنت اور مفتی اعظم ہند نے ہمیشہ اس کی وسعت و ترقی کے لیے دعائیں کی ہیں، اس کے تعاون کے لیے اپیلیں لکھی ہیں، یہ ان کی جماعتی ہمدردی کا ایک رخ ہے۔ اشرفیہ نوازی کے حوالے سے مجھے ان کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ مدرسہ فیض العلوم سرائے ترین سنبھل کے صدر حاجی محبوب رضوی نے ایک بار بیان کیا کہ ہم چند مریدین سنبھل سے سرکار مفتی اعظم ہند کے حضور حاضر ہوئے۔ ہم لوگ مؤدب بیٹھے اکتسابِ فیض کر رہے تھے، ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت اور پریشانی بیان کر کے دعا اور تعویذ لے رہا تھا۔ اسی درمیان سرکار مفتی اعظم ہند کا ایک شیدائی حاضر ہوا اور اس نے سلام و دست بوسی کے بعد عرض کیا: حضور! میرے پاس اپنی زکوٰۃ کی رقم ہے، اسے آپ کسی مناسب جگہ لگا دیں۔ حاجی محبوب رضوی کا بیان ہے کہ سرکار مفتی اعظم ہند نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ارشاد فرمایا: اس وقت دین و سنیت کا سب سے بڑا کام اشرفیہ، مبارک پور کر رہا ہے، آپ اپنی رقم مبارک پور بھجوا دیں۔ حاجی محبوب رضوی بیان کرتے ہیں کہ سرکار مفتی اعظم ہند کا یہ ارشاد سن کر ہمارے دلوں میں بھی جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے محبت بڑھ گئی۔

اس بار یومِ مفتی اعظم ہند میں توسیعی خطاب کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بجائے خطاب کے مقالہ پیش کیا، جسے علما اور طلبہ نے بے پناہ پسند کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے متعارف تو بہت پہلے سے تھا، کوئی خاص متاثر نہیں تھا، مگر اس مقالے نے میری سابقہ سوچ پر پانی پھیر دیا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب نے اس بار مقالہ نگاری میں قلم کے ساتھ دل کا بھی خاصا استعمال کیا تھا اور دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ مقالے کا عنوان تھا "اہلِ سنت و جماعت - انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کا تدارک" ڈاکٹر فاروقی کے مصنفہ اور مرتبہ کتب و رسائل کی تعداد ۲۳؍ ہے اور مختلف موضوعات پر مطبوعہ مضامین کی تعداد ۸۰؍ تک پہنچ چکی ہے، جب کہ خود مصنف کو اس منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی بیس برس سے بھی زیادہ کا انتظار کرنا پڑے گا، اس لیے ان کے قلم سے ابھی بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

قارئین کی تسکینِ خاطر کے لیے عرض ہے کہ ڈاکٹر فاروقی جلیل القدر صوفی اور بلند پایہ محدث و مفسر علامہ مبین الدین امروہوی کے اکلوتے فرزندِ ارجمند ہیں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے بھی یہ نسبت ابنیت ہم نے اس لیے سپردِ قلم کر دی کہ بعض حضرات کے نزدیک کسی کبیر و شہیر کا بیٹا ہونا خود باپ سے بھی زیادہ فضیلت کی بات ہوتی ہے۔ حالاں کہ ایک کامیاب انسان کی حقیقی شناخت وہی ہے جو اس کے محنت کش ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فاروقی صاحب نے اہلِ سنت و جماعت کے انتشار و پسپائی کے اسباب کی تشخیص فرمائی اور تدارک کے لیے انتہائی مفید اور کار آمد نسخے بھی تجویز کیے۔ اس مقالے کو آپ ماہ نامہ اشرفیہ کے اسی شمارے سے پڑھنا شروع کر دیں گے، اس لیے اس پر تبصرہ اب آپ کی منصبی ذمہ داری بنتی ہے۔ سرِ دست ہم اہلِ سنت کی موجودہ پسپائی کے ایک اہم اور بنیادی سبب کی جانب آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی جانب ڈاکٹر فاروقی کی نظر جاتے جاتے رہ گئی۔

صاحبو! بگوشِ ہوش سنو! اہلِ سنت کے انتشار و پسپائی کا سب سے بڑا سبب جو سارے اسباب کی بنیاد ہے وہ ہے— فکر و عمل کا عدمِ توازن— جب کہ یہ ایک سچائی ہے کہ شخصیت کی تعمیر کا مسئلہ ہو یا جماعتی فلاح و بہبود کا قضیہ، فکر و عمل میں توازن کا برقرار رہنا بنیادی چیز ہے۔ فکر و عمل کے توازن کی صورت میں بڑے سے بڑا معرکہ معمولی کوشش سے حل کیا جا سکتا ہے اور عدمِ توازن کی صورت میں معمولی بار بھی پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ تقریبِ فہم کے لیے اسے آپ اس طرح سمجھیں - کبھی عہدِ لاشعوری میں کسی بازی گر کو آپ نے یہ کرتب دکھاتے دیکھا ہو گا۔ ایک رسی تنی ہوئی ہے، جس پر ایک بازی گر چل رہا ہے۔ بازی گر کے کاندھوں پر ایک کرسی ہے، کرسی پر ایک لڑکی ہے اور اس لڑکی کے ماتھے پر ایک سلاخ کھڑی ہے۔ اس انتہائی نازک صورتِ حال کے باوجود کرتب باز رسی پر چل رہا ہے۔ یہ سارا کرشمہ تمام اشیا میں توازن کی وجہ سے ہے۔ اگر باہم توزن بگڑ جائے تو پلک جھپکتے ہی سارا

کھیل زمیں بوس ہو جائے گا۔ یہی حال انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ اس مقابلہ جاتی دور میں جماعتی سفر کی شاہراہ اس بازی گر کی رسی سے بھی زیادہ نازک اور سنگین ہے، لیکن اگر تمام امور میں توازن برقرار رکھا جائے تو جماعتی وسعت وترقی کا سفر تیز بھی ہو سکتا ہے اور آسان بھی۔

جماعتی سطح پر عدم توازن کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے اپنا ایک مخصوص جماعتی مزاج بنا رکھا ہے۔ حالات کے شدید تقاضوں کے باوجود بھی ہم اپنی روایتی ڈگر سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، حالاں کہ یہ ایک تجرباتی اور مشاہداتی سچائی ہے کہ فرد کی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، اس کے مختلف تقاضے اور لوازم ہوتے ہیں۔ ایک انفرادی زندگی کے لیے کھانا پینا بھی ضروری ہے اور رفع حاجت کے لیے جانا بھی، آب وہوا بھی ضروری ہے اور لباس ومکان بھی، تنہائی بھی ضروری ہے اور معاشرتی ربط وضبط بھی۔ اب اگر کوئی قسم کھا لے کہ مجھے صرف کھانا پینا ہے، رفع حاجت کے لیے نہیں جانا ہے، یا زندگی بھر تنہا رہنا ہے معاشرتی زندگی غیر ضروری ہے، تو اس انسان کے اس فکری اور عملی عدم توازن کو دیکھ کر لوگ فیصلہ کرلیں گے کہ یہ شخص دماغی عدم توازن کا شکار ہے اور اس فیصلے کے بعد سماجی اور ملکی سطح پر لوگ اسے نظر انداز کر دیں گے۔

اب اسی طرح جماعتی زندگی کی تعمیر وترقی کے لیے دعوت وتبلیغ، تصنیف وتقریر، رشد وہدایت، سیاست وصحافت، تعلیم وتربیت، تحریک وتنظیم وغیرہ بہت سے امور ہیں اور ان میں سے ہر ایک بھرپور منصوبہ بندی اور مسلسل توجہ کا طالب ہے۔ مگر ہمارے یہاں بعض چیزوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ ہے اور بعض چیزیں شجر ممنوعہ سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً مدارس کو دیکھ لیجیے، جن علاقوں میں ہمارے مدارس نہیں ہیں تو بالکل نہیں ہیں اور جن علاقوں میں یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے، وہاں دن بہ دن بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ بس اساتذہ اور انتظامیہ میں ذرا شکر رنجی ہوئی اور پہلے مدرسے کی ٹھیک ناک کے سامنے ایک دوسرا مدرسہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے برخلاف تصنیفی اور تحقیقی اداروں کا بڑی حد تک فقدان ہے، ملی اور سیاسی میدان میں علمائے اہل سنت کی کوئی قابلِ ذکر نمائندگی نہیں۔ دعوت وتبلیغ کی پہلے کوئی تحریک ہی نہیں تھی۔ اب جو تحریکیں ملکی اور عالمی سطح پر کام کر رہی ہیں تو ان کی بے پناہ مخالفت کی جارہی ہے۔ اس عہد میں خامیاں کس طبقے میں نہیں ہیں۔ کیا خطبہ، علما اور پیرانِ طریقت میں، بہت سے لوگ قابلِ اصلاح نہیں ہیں؟ اب آپ بتائیں کہ ان کی باادب اصلاح کی جائے گی یا انھیں جماعت ہی سے خارج کر دیا جائے گا۔ مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے، یا گردن دبا کر موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے؟ اسی طرح پورے ملک میں اہل سنت وجماعت کا کوئی ملک گیر قابلِ ذکر اخبار نہیں۔ اب اس میڈیائی دور میں اہل سنت کی نمائندگی ہو تو کیسے؟ وہ تو کہیے، اہلِ پاکستان نے اہلِ سنت کی پیغام رسانی کی کچھ سبیلیں نکال لیں اور اہلِ سنت کی لاج بچ گئی۔

ایسا نہیں کہ علمائے اہلِ سنت جماعتی تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ دراصل تساہلی اور فکر وعمل کے عدم توازن نے انھیں منفی فکر کا حامل بنا دیا۔ وہ عمل کے بجائے ردِ عمل کے عادی ہو گئے، جس کی وجہ سے غور کرنے اور عمل کرنے کی قدر کم کی جاتی ہے، اس پر تنقیدیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ آپ کچھ نہ کریں کسی کو کوئی شکایت نہیں، اور کچھ کیجیے تو اس سے پہلے اپنوں کے شب وستم اور نشانۂ غضب بننے کا حوصلہ پیدا کیجیے — یہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ بر وقت اتنا یاد رکھیں کہ ہمیں جماعتی سطح پر تمام گوشوں اور تمام شعبوں میں یکساں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ فکر وعمل کا یہ عدم توازن ہمارے جماعتی انتشار اور پسپائی کا ایک بنیادی سبب ہے۔ ہماری ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا یا ہمیں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا نشانہ بنایا جائے گا ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب آگے ہمیں خود غور یہ کرنا ہے کہ: ع: کیا طرزِ سخن ہو کہ تو انکار نہ کر پائے۔

مگر ہمارے طرزِ سخن سے پہلے صدر الافاضل مراد آبادی کے طرزِ سخن کا اضطراب ملاحظہ کیجیے۔ سنیے تو سہی یہ خلفائے امام احمد رضا کی بزم کا سب سے بڑا مفکر ہے اور جماعتی فلاح وبہبود کے لیے علمائے اہل سنت سے کس دردمندی کے ساتھ منت وسماجت کر رہا ہے:

"ستم ہے کہ جاہل، عالم نما عالم بن کر میدان میں آئیں اور ان کی تعداد سے دنیا کو دھوکا دیا جائے اور ان کی خود رائی اور نفس پرستی کو علما کی رائے قرار دیا جائے اور علما کا پورا طبقہ کا طبقہ ساکت وخاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھا کرے، نہ اس کے منہ میں زبان ہو، نہ زبان میں حرکت، نہ ہاتھ میں قلم، نہ قلم میں جنبش۔ اب آپ کا یہ تقاعد زہد وانکسار کی حد سے گزر کر غفلت وتکاسُل کے دائرے میں آگیا ہے اور اس اندازِ سکوت سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب آپ اس عقیدے کو چھوڑ دیجیے کہ آپ کے فرائض ایک مجلس میں وعظ کہہ کر یا ایک حلقہ میں درس دے کر یا ایک خلوت خانے میں فتویٰ لکھ کر ادا ہو جاتے ہیں اور آپ کو اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اور بدخواہانِ اسلام تخریب کے لیے کیا کیا تدابیر عمل میں لا رہے ہیں؟ یقیناً یہ آپ کا فرض ہے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اٹھیے اور اپنے فرض کو ادا کیجیے"

(ماہنامہ السواد الاعظم مراد آباد۔ شمارہ رجب المرجب ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء) ☆☆☆

صدائے بازگشت

یہ کالم ایک "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"۔ اس کے تحت علمی، فکری، تنقیدی اور تجزیاتی مراسلات کو ترجیح دی جائے گی۔

سخن گفتن چہ مشکل بود

حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب۔ السلام علیکم

رات کی ڈاک میں ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور دسمبر ۲۰۰۹ء کے دو پیکٹ علاحدہ علاحدہ ملے، آپ کی یادیں رجال الغیب بن کر آئیں اور مجھے تین بجے سحری کے وقت بیدار کر دیا کہ

ع: مبارک گرفت آستینم کہ قم

سارا رسالہ پڑھ گیا، آپ کو یاد کرتا گیا۔ "مبارک پور سے برکات نگر تک" پڑھا۔ یہ آپ کا اداریہ بھی تھا اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے مرشد خانہ، خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے عرسِ برکاتی کی تقریبات کی داستان بھی تھی۔ آپ ہندوستان کے علمائے کرام کا ایک قافلہ لے کر پہنچے اور وہاں کے روز وشب کے مشاہدات لکھتے گئے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ آپ اس قافلہ میں مجھے بھی ساتھ لیے پھرتے ہیں اور جلیل القدر علمائے اہلِ سنت سے تعارف کرا رہے ہیں، پھر ان کی تقاریر، بیانات، خطابات آپ کے ساتھ بیٹھے سن رہا ہوں۔ ان حضرات میں سے بہت سے چہرے میرے دیکھے ہوئے ہیں، بعض کے قلمی چہرے سامنے آرہے ہیں اور بعض کا آپ تعارف کرا رہے ہیں۔ میں ساری باتیں سنتا رہا مگر

ع: سخن گفتن چہ مشکل بود، شب جائے کہ من بودم

اللہ آپ کو خوش رکھے، جامعہ اشرفیہ کی علمی مجالس اور دوسرے مضامین پسند آئے۔ آپ نے میرا مضمون "حضرت خضر علیہ السلام بزرگانِ دین سے ملاقاتیں کرتے ہیں" بھی شائع کر دیا اور میں یوں پڑھتا گیا جیسے یہ میرا تازہ مضمون ہے۔ پڑھتے پڑھتے لطف آگیا۔ آپ نے اس قندِ مکرر کو "گلِ تازہ" بنا کر شائع کیا۔

مجھے آپ کی تازہ تصنیف "شہر خموشاں کے چراغ" کا اشتیاق ہے، ابھی تک نہیں پڑھ سکا۔ پاکستان میں اسے کسی دوست کے پاس نہیں دیکھا اور اس طرح محروم رہا۔

اشرفیہ پر اب ڈاک والوں نے بڑے ٹکٹ لگوانے شروع کر دیے ہیں، اس طرح اشرفیہ بڑا گراں پڑتا ہے۔

آپ کی خدمت میں "جہانِ رضا" دسمبر کے چند شمارے ارسال کر رہا ہوں۔ ایک تفسیر "کنز العرفان" کی دو جلدیں ہدیہ کر رہا ہوں۔ یہ نزولی ترتیب سے مرتب کی گئی ہے اور صرف اردو میں، ایک نظر دیکھ لیں ورنہ آپ کی ذاتی لائبریری کا ہدیہ ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میری ساری کتابیں جو میرے احباب نے میری علمی خدمات پر لکھی ہیں آپ کے مطالعہ خانہ میں موجود ہوں۔ والسلام بالوف الاحترام

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، لاہور، پاکستان

گجرات کے بزرگوں کی خدمات کو منظر عام پر لایا جائے

مدیرِ محترم ماہنامہ اشرفیہ — سلام مسنون

طویل انتظار کے بعد نومبر ۲۰۰۹ء کے شمارے کی زیارت دار العلوم حبیبیہ کوٹھنار شریف گجرات کی لائبریری میں ہوئی۔ اداریے میں آپ نے مرکزی مدرسہ بورڈ کے تعلق سے علمائے دیوبند کے سخت رویے اور ان کی موہوم مخالفتوں کے مضمرات پر نہایت بے باکانہ گفتگو کی ہے۔ اداریے کے مطالعے کے بعد علمائے دیوبند کی مخالفتوں کا اصل سبب بھی سمجھ میں آگیا۔ فکرِ امروز کے کالم میں مولانا اسحاق رضوی مصباحی کی مجلس شوریٰ کی رپورٹ پسند آئی، انھوں نے باتوں باتوں میں بڑے قیمتی نکات ذکر کر دیے ہیں۔

عید الاضحیٰ کی تعطیل میں گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، وہاں کی متعدد خانقاہوں اور تاریخی مقامات پر حاضری ہوئی۔ گجرات سے مسلمانوں کا رشتہ نہایت قدیم ہے، خصوصاً گجرات کے ساحلی علاقے بے شمار اسلامی مجاہدین اور شہدائے کرام کی آرام گاہیں ہیں۔ ضلع جوناگڑھ میں ویراول سے متصل پاٹن کا علاقہ ہے۔ اسی آبادی میں لبِ دریا سومناتھ کا مندر بھی ہے جسے ایک زمانہ میں حضرت محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح کیا تھا۔ یہیں حضرت حاجی ابو الحسن عراقی رحمۃ اللہ علیہ بھی آرام فرما ہیں جو سلطان الہند خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے قبل دین کی تبلیغ واشاعت کی خاطر ہندوستان تشریف لائے تھے۔

اسی بابرکت زمین میں جعفر و مظفر کے نام سے معروف دو جلیل القدر بزرگوں کے مزارات بھی ہیں۔ بزرگوں کے بیان کے مطابق یہ دونوں حضرات سگے بھائی اور حضرت محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی فوج کے جاں باز سپاہی تھے۔ یہ پورا علاقہ بزرگوں کے مزارات کا مرکز اور تاریخی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

لیکن افسوس! اب لوگوں کی زبانوں پر صرف ان بزرگوں کے نام رہ گئے ہیں، ان کے حالات، ان کی خدمات کو بتانے والا کوئی نہیں۔ عقیدت مند ان کی بارگاہوں میں حاضری دیتے ہیں اور اپنے دامن کو مرادوں سے بھر کر واپس ہو جاتے ہیں۔

ضلع جوناگڑھ ہی میں کوڑینار شریف ایک مشہور خطہ ہے جہاں سیدی سرکار غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی نویں پشت کے بزرگ حضرت سید رزق اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ آرام فرما ہیں۔ ان کا خانوادہ اب بھی یہاں آباد ہے۔ انھیں کے نام سے منسوب یہاں ایک دینی تعلیمی ادارہ دار العلوم فیضان رزق اللہ قائم ہے۔ بقول مولانا شکیل احمد مصباحی استاذ دارالعلوم حبیبیہ کوڑینار شریف آپ کے حالات پر مشتمل ایک فارسی رسالہ بھی ہے جو خانوادے کے کسی بزرگ کے پاس محفوظ ہے۔ اس رسالے کا اردو ترجمہ شائع ہونا چاہیے تاکہ آپ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف گوشے قوم کے سامنے آسکیں۔

گجرات کا مشہور تفریحی علاقہ ڈیو (Diu) جو مرکز کے زیرِ انتظام ہے، یہاں بھی متعدد بزرگانِ دین آرام فرما ہیں، خصوصاً حضرت بالم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار یہاں کے سنیوں کا مرکز ہے۔ روزانہ ہزاروں عقیدت مند آپ کے آستانے پر حاضر ہو کر فیوض و برکات سے مستفید ہوتے ہیں۔

ان جلیل القدر بزرگانِ دین کی خدمات کو منظر عام پر لانا اور ان کی حیاتِ مقدسہ کے روشن پہلوؤں کو قوم تک پہنچانا ہم سبھوں کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ خصوصاً گجرات سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ انفرادی طور پر یہ کام نہایت مشکل ہوگا۔ اس کے لیے باضابطہ اکیڈمی کی ضرورت ہے جس کے تحت فعال افراد کی ایک مضبوط ٹیم ہو جسے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور متعلقہ افراد کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر کے اس اہم کام پر مامور کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے افراد کے ساتھ ساتھ فنڈ کی ضرورت ہوگی لیکن مجھے امید ہے کہ گجرات کے خوش عقیدہ مسلمان اپنے بزرگوں کے نقوشِ حیات کی حفاظت اور تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے اس کارِ خیر میں دل کھول کر حصہ لیں گے، بس ضرورت ہے پیش قدمی کی، اسباب خوب بخود میسر ہوتے جائیں گے۔

واللہ الموفق والمعین فقط

محمد ساجد رضا مصباحی، جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اوریا

جیسی کرنی ویسی بھرنی

جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون

دسمبر کا شمارہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ "مبارک پور سے برکات نگر تک" اداریہ پسند آیا۔ یہ دور جس میں اعراس کی معنویت اور روحانیت کا گراف دن بدن گھٹتا جا رہا ہے، عرس کے نام پر عقیدت مندوں کو لوٹا جا رہا ہے اور ان کے مال پر ہاتھ صاف کر کے اپنی جیب گرم کی جا رہی ہے۔ ایسے دور میں خانقاہِ برکاتیہ نے ایک انفرادی مثال قائم کی ہے۔ افراط و تفریط سے ہٹ کر شریعت کے دائرے میں عرس تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ترقی اور روشن مستقبل کے لیے بھی لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے۔ اسے قابلِ تقلید پیش رفت کہا جا سکتا ہے۔ تعلیم ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس میدان میں مسلمان دوسری قوموں سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس کا اصل سبب مسلمانوں کی معاشی کم زوری ہے۔ ایک غریب مسلمان جو کہ شب و روز کی محنت و مشقت کے بعد بمشکل اپنے بال بچوں کی روزی روٹی کا انتظام کرتا ہے۔ ایسے میں کثیر اخراجات والے یونیورسٹیز میں اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ خانقاہِ برکاتیہ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر رکھے، جہاں سے آسمان چھوتی مہنگائی کے اس دور میں بھی غریب، نادار اور مفلوک الحال بچوں کی مفت تعلیم کا اعلان کر دیا گیا ہے، جو نہ جانے کتنے غریب بچوں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرے گا۔

مسائل و مباحث کے کالم میں "مرکزی مدرسہ بورڈ" کے سلگتے ہوئے مسئلہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں اس تعلق سے بڑی افراتفری اور گہماگہمی کا سماں بندھا ہوا ہے۔ کوئی مخالفت میں قلم کا سارا زور صرف کر رہا ہے تو کوئی موافقت میں قلم کی جولانی دکھا رہا ہے۔ اس کالم میں شائع شدہ تحریروں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علمائے اہل سنت اس سلسلے میں مثبت موقف رکھتے ہیں اور بہار، بنگال میں جس طرح مدارس ایڈ ہو رہے ہیں

اسے خوش آئند پہلو تصور کیا جا رہا ہے۔ مگر مولانا محمد اسحاق مصباحی صاحب اسے شیطانی مکر و فریب بتا رہے ہیں۔ اپنے مضمون "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا دوسرا اجلاس" کی آخری قسط میں ابلیس کے ناپاک منصوبوں کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "تمام مدارس کو حکومت کے کنٹرول میں کرنا ضروری ہے تاکہ تمام دنیا میں ان کا حال بنگال و بہار کے سرکاری مدارس کا سا ہو جائے۔"

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بہار و بنگال کے مدارس میں جو تعلیمی انحطاط آیا ہے وہ ان مدارس کے ایڈ اور حکومت سے الحاق کی بنیاد پر ہے۔ مولانا موصوف کا یہ خیال زمینی حقائق سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ کافی عرصہ بعد مولانا نثار احمد مصباحی اپنی نگارشات لے کر بزمِ اشرفیہ میں حاضر ہوئے ہیں اور امام عبد القاہر جرجانی علیہ الرحمہ کے عقیدے کے تعلق سے امام النحو علیہ الرحمہ کے موقف پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ کسی بھی معروف شخصیت کے اختیار کردہ موقف کے خلاف قلم اٹھانا ایک چیلنج بھرا کام ہے۔ اس دور میں تو یہ کام کرنا اپنی سنیت ہی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ دوسرے سطر سطر پر اپنے اشہبِ قلم کو ادب کی زمام میں باندھنا بھی ضروری ہے اور اگر تحقیق میں ذرہ برابر بھی نقص اور کمی رہ گئی تو لعنت پر مبنی خطوط کا تانتا بندھنا یقینی امر ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے اپنے اور اپنی تحقیق پر پورا بھروسا ہو۔ موصوف کے یہ جملے کہ "فقیر کو ان کے ماخذ تک رسائی نہیں ہو سکی۔ آپ حضرات مطلع ہوں تو اس فقیر کو بھی آگاہ فرمائیں۔" ان کی وسعتِ ظرفی اور کشادہ قلبی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

تبصرہ کے لیے اس بار فخرِ صحافت مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب کی مایہ ناز کتاب "شہر خموشاں کے چراغ" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے علیمی صاحب اس کتاب پر "حملہ آور تبصرہ" فرما کر دل کا غبار نکال چکے ہیں۔ مولانا ساجد صاحب نے اس کے برخلاف اس کتاب پر "دفاعی تبصری" تحریر فرمایا ہے، جس میں حتی الامکان علیمی صاحب کی طور مار بیانی اور ان کے ذہنی خلجان کو دور کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، فکر میں بالیدگی قرطاس و قلم کی اولین شرط ہے۔ اللہ نے انھیں قلمی قوت عطا فرمائی ہے تو اسے سنیت کے فروغ اور دین کی نصرت و حمایت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح کی تحریر لکھ کر قرطاس و قلم کی حرمت کو پامال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ علیمی صاحب کی ایسی ہی گل افشانیاں دیکھ کر سیف الدین اصدق برملا یہ کہہ گئے کہ علیمی صاحب کے تبصرے کی مثال اس نوکر کی طرح ہے جو مالک سے ویرانیِ گلستاں کا شکوہ بھی کرتا ہے اور باقی سب ٹھیک ہے کہہ کر مذاق بھی اڑاتا ہے۔ آصف رضا مرادآبادی نے اچھا تعاقب کیا ہے۔ کہیں کہیں تیکھے جملے بھی رقم ہو گئے ہیں۔ مثل مشہور ہے: "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

فقط **محمد عابد چشتی**، جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اوریا

گستاخِ رسول کی ایک اور ناپاک سعی

مدیرِ اعلیٰ جناب مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب قبلہ

سلام و رحمت

جنوری کا ماہ نامہ اشرفیہ مطالعہ کی میز پر ہے۔ رسالے کے تمام مشمولات خوب سے خوب تر ہیں اور قارئین کے دلوں میں علم و حکمت کی شمع فروزی کے لیے خاصا سامان لیے ہوئے ہیں۔ خصوصاً آپ کا غیر جانب دارانہ اداریہ "اصل مسئلہ دہشت گردی کی حمایت کا ہے" آپ کی گہری بصیرت اور حق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے جس خوب صورت پیرائے میں دہشت گردوں کی حمایت کرنے والوں کی نقاب کشائی کی ہے اگر اسی طرح اربابِ علم و دانش نے سنجیدگی سے اس معاملے کو لیا تو انشاء اللہ دنیا پر آشکارا ہو جائے گا کہ اسلام کو جتنا نقصان وہابی ازم کے علم بردار شدت پسند طابان سے ہوا، وہ غیروں کے نقصان سے کہیں زیادہ ہے۔

مسائل و مباحث میں مولانا انور علی نظامی مصباحی کا مضمون فقہی نقطۂ نظر سے۔ فکرِ امروز کے کالم میں مولانا اسحاق مصباحی صاحب قرآن و حدیث کے معانی و مفاہیم کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے والوں کے خلاف برسرِ پیکار نظر آئے۔ مولانا کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ عقلیت پسندی کی بنیاد پر عقائدِ اسلام کی تشریح اسلامی روح کے منافی ہے۔

علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ کا مضمون ماہ نامہ اشرفیہ کی زینت بنانے پر ہم آپ کی بصیرت کی داد دیتے ہیں۔ بلاشبہہ شیخ الجامعہ نے مدارس کے تعلق سے جو تابندہ نقوش دیے ہیں، اربابِ حل و عقد کو سنجیدگی سے انھیں اپنانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر فاروق احمد صدیقی اسلام کے تئیں بد گمانی رکھنے والی ذہنیت کا قلع قمع کرتے ہوئے چمنِ اشرفیہ میں وارد ہوئے۔ بلاشبہہ بموں سے خود کو اڑا کر جہاد کا نام دینے والوں کے لیے آپ کا مضمون تازیانۂ عبرت ہے۔

مولانا محمد طفیل احمد مصباحی نے یہودی قوم کی امن مخالف

پالیسیوں کو ماضی و حال کے تناظر میں اجاگر کرتے ہوئے یہودی ذہنیت کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے جس کے لیے مولانا موصوف کو مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام مخالف سرگرمیوں میں صیہونیت پسند استعماری طاقتوں کا بے پناہ عمل دخل رہا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج مسلم حکمرانوں کی عیش کوشی، وہابی ازم کے علم بردار شدت پسند طالبان اور امتِ مسلمہ کی تساہل پسندی نے اسلام مخالف طاقتوں کو اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کو پورا پورا موقع دیا ہے، جس کی وجہ سے اسلام مخالف سرگرمیوں میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ اسلام دشمنی ہی کا شاخسانہ ہے کہ اسلام جیسے مہذب اور امن پسند مذہب اور انسانیت نوازی کے علم بردار سید ﷺ کے خلاف زہر افشانی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں تو صیہونی طاقتیں جمہوریت کے نفاذ کا بہانہ بنا کر اسلامی ممالک پر قبضہ و تسلط جما کر مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا رہی ہیں شدت پسند عناصر صیہونی آقاؤں کے اشاروں پر ڈنمارک اور اس کے ہم نوا یورپین ممالک میں اظہارِ رائے کی آزادی کا بہانہ بنا کر اسلام دشمنی کا ثبوت مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے کارٹون اور فلم کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور اب تو گنگا جمنی تہذیب کے حامل ہندوستان جیسے جمہوریت پسند ملک میں باہمی ہم آہنگی کے تار و پود بکھیرنے اور مسلمانوں کو ان کے مقاصدِ اصلی سے منحرف کرنے کے لیے شدت پسند افراد تحریر و تقریر کے ذریعہ حضور ﷺ کے خلاف بے بنیاد باتیں کرتے ہیں جس سے اپنے خبثِ باطل کی تسکین محسوس کرتے ہیں، جس کی تازہ ترین مثال ممبئ میں لکھی جانے والی کتاب "اے کانسپٹ آف پولیٹیکل ورلڈن ویژن بائی مسلمس" اور روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے انگریزی نصاب ایم. اے. میں شامل "ہیئر ایر پورٹ" نامی کتاب ہے جس میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے صاف و شفاف چہرے پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک سعی کی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اول الذکر کتاب پر ممبئ ہائی کورٹ نے پابندی عائد کر دی ہے جب کہ موخر الذکر کتاب کے خلاف ملک گیر احتجاج کے باوجود تادم تحریر کوئی مثبت کارروائی منظر عام پر نہیں آئی۔

سوال یہ ہے کہ شدت پسند افراد ملک میں تخریبی کارروائی کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے زخموں پر تحریر و تقریر کے ذریعہ نمک پاشی کریں اور اس کے جواب میں ہندوستانی عدلیہ کا صرف ان کی کتابوں پر پابندی عائد کر دینا مسلمانوں کے زخموں کا مداوا ہو جانے کے لیے کافی ہے؟ کیا ملک میں تخریبی ذہنیت کے افراد کی بیخ کنی کرنے کے لیے یہ عمل کافی ہے؟ اگر نہیں، تو صرف اتنے پر اکتفا کیوں؟

اخیر میں مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ قوم سے کیے ہوئے اس وعدے کو فراموش کر بیٹھے ہیں جس کی بنیاد پر آپ قوم کے ملی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کے لیے پارلیمنٹ تک پہنچے مگر آپ کی شانِ بے نیازی کا یہ حال ہے کہ اپنے ذاتی اختلافات کی بنیاد پر پورے ملک میں شعلہ بیانی سے کہرام بپا کر دیں لیکن دینی حمیت کا حال ہے کہ بعد از خدا بزرگ سید عالم ﷺ کے خلاف زہر افشانی کی جائے اور آپ مصلحت پسندی کی خاطر مہر بلب رہیں۔ کیا آپ کو اسلام کی بقا اور تحفظ سے دل چسپی نہیں؟ اگر ہے، اور ضرور ہے تو جلد از جلد تحفظ عصمت رسول ﷺ کا قانون پارلیمنٹ میں منظور کرائیں، جس کی رو سے گستاخان رسول کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ فقط

محمد عارف حسین مصباحی، بہرائچ

مسلم قیادت کے مضمحل ڈھانچے کو از سرِ نو مستحکم کیا جائے

جناب ایڈیٹر صاحب　　　　سلام مسنون

سچر کمیشن رپورٹ کے بعد رنگاناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ سے مسلمانوں کی ہمہ جہت سماجی پس ماندگی ایک بار پھر عیاں ہو چکی ہے۔ پارلیمنٹ اور میڈیا میں مشرا کمیشن رپورٹ کی سفارشات پر عمل در آمد اور ان کے نفاذ کے مسئلہ کو لے کر بحثیں بھی ہو رہی ہیں۔ مسلم لیڈر حکومت سے ان سفارشات کے نفاذ کے خواہاں ہیں اور اربابِ صحافت، میڈیا کے سہارے حکومت پر دباؤ بنائے رکھنے کی پر زور وکالت کر رہے ہیں۔

میری ناقص رائے میں علمائے کرام اور مسلم دانش ور اپنے اپنے حلقہ اثر میں متحد اور مضبوط سیاسی پلیٹ فارم قائم کریں اور اسلام اور مسلمانوں کی حمایت کا ایسا آوازہ بلند کریں کہ اس کی دھمک پارلیمنٹ کے ایوانوں تک سنائی دے اور حکومت مسلم مسائل کو حل کرنے پر مجبور ہو جائے۔

سیاسی بکھراؤ، قوتِ ارادی کا فقدان اور ملی قیادت کا عدم استحکام ہی کسی بھی مسئلہ کو لاینحل کرنے کا اصل سبب ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم قیادت کے مضمحل ڈھانچے کو از سرِ نو مستحکم کیا جائے۔ علمائے اہل سنت اب گوشہ نشینی کو ترک کر دیں۔ دین و ملت کے بے شمار مسائل انھیں چیخ چیخ کر آواز دے رہے ہیں۔

فقط　　**آفتاب عالم مصباحی، مالدہ، مغربی بنگال**

رودادِ چمن

یومِ مفتیِ اعظم ہند میں تحریری مسابقہ

جامعہ اشرفیہ میں ہر سال کی طرح اس سال بھی طلبۂ جماعت سابعہ کے زیر اہتمام "جشن مفتیِ اعظم" کا انعقاد عزیز ملت علامہ عبد الحفیظ سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ کی سرپرستی اور شیخ الجامعہ علامہ محمد احمد مصباحی کی صدارت میں ہوا۔ نظامت کے فرائض مولانا رضوان مرادآبادی نے انجام دیے، جس میں ملک و ملت کے وسیع تناظر میں اہل سنت و جماعت کی ملکی، دینی اور ملی خدمات اور موجودہ انتشار اور اس کے اسباب و تدارک پر غور و خوض کیا گیا۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ نے اہل سنت کے انتشار اور پسپائی اور اس کے اسباب و تدارک سے متعلق اپنے خطاب میں کہا کہ سواد اعظم اہل سنت کو مسلمانوں کی سماجی، ملی اور دینی ضرورتوں کو ہر محاذ پر پورا کرنے کے لیے موجودہ دور میں مزید پیش قدمی کرنے ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ دعوت و تبلیغ کے حوالے سے ہمیں منفی پہلو سے احتراز اور مثبت رویہ اختیار کرنا چاہیے، کیوں کہ عمل اور رد عمل میں اثر و رسوخ عمل کا ہوتا ہے، انہوں نے مزید کہا کہ خود کو بغض و کینہ سے صاف کر کے باہمی ربط و ہم آہنگی اور یکجہتی کا راستہ اپنا کر آگے بڑھنے سے مثبت نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں، انہوں نے اخیر میں کہا کہ شخصی اور ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر خالص ملی اور دینی مفاد کے مد نظر عوام الناس کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے شریعت مطہرہ اور اس کے احکام سے روشناس کرانا ہمارا اولین فریضہ ہے۔ مولانا عبد المبین نعمانی مصباحی نے اپنے بیان میں حیات مفتیِ اعظم کے درخشندہ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ماضی قریب میں مفتیِ اعظم ہند زہد و تقویٰ، خلوص و للّٰہیت اور شریعت مصطفیٰ کی پابندی میں اپنی مثال آپ تھے، آپ ایسی سنتوں پر بھی بڑی سختی سے عمل کرتے تھے جن کی طرف عام طور پر ذہن بھی نہیں جاتا، انہوں نے کہا کہ جشن منعقد کرنے کا مقصد اسلاف کی یاد تازہ کر کے ان کے نقش قدم پر چلنا اور ان کی تعلیمات کو عام کرنا ہے۔

تنظیم ابنائے اشرفیہ کے جنرل سکریٹری مولانا مبارک حسین مصباحی نے موجودہ مسائل اور اجتماعی ذمہ داریوں کے حوالے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام جیسے مہذب اور امن پسند مذہب کے ہمہ گیر دعوتی پیغام کو عام کرنے کے لئے زمانے کے تقاضوں سے باخبر ہونا لازمی ہے، کائنات عالم میں انبیا کرام کے آمد کے فلسفے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے اور باطل کی سرکوبی کے لیے اس دور کی ضروریات سے آراستہ ہو کر جلوہ فگن ہوئے تھے، انہوں نے مزید کہا آج ہندوستانی مسلمانوں میں غربت و افلاس کی نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ بعض علاقوں میں انہیں دو وقت کا کھانا بھی میسر نہیں، غربت و افلاس کو دور کرنے کے لیے مذہب تک تبدیل کرنے پر مجبور ہیں، حکومت ہند "رنگا ناتھ مشرا کمیشن رپورٹ" کو نافذ کر کے مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کا نظم کرے اور انھیں سماج میں دیگر اقلیتوں کی طرح بہتر سہولیات بہم پہونچائے۔

عبد اللہ مصباحی ملاپورم نے انگریزی زبان میں "اسلام اور دہشت گردی" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنا صحیح نہیں کیوں کہ اسلام اور دہشت گردی دو متضاد حقیقتیں ہیں جن کا اجتماع محال ہے۔

نعت و منقبت کمال احمد، سرفراز احمد، وسیم اکرم، محمد یونس، اور محمد احمد نے پیش کیں، محمد نعیم مالیگاؤں نے ترانۂ اشرفیہ اور غلام مجتبیٰ کلکتہ نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

پروگرام میں تحریری مقابلہ میں مجموعی طور پر ۲۹۶؍ طلبہ نے اردو، عربی اور انگریزی زبان میں حصہ لیا اور مقالات تحریر کیے، تقریری مسابقے میں تین عناوین پر ۶۷؍ طلبہ نے تینوں زبانوں میں حصہ لیا۔ دونوں مسابقوں میں ہر عنوان پر اول، دوم، سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو اعزازی اور بقیہ طلبہ کو ترغیبی انعامات سے نوازا گیا۔ پروگرام میں مفتی زاہد علی سلامی، مولانا صدر الوریٰ مصباحی، مولانا نفیس مصباحی، مولانا ساجد مصباحی، مولانا نعیم الدین مصباحی، مولانا حبیب اختر مصباحی، ناظم اعلیٰ حاجی سرفراز احمد، مولانا ہارون مصباحی، مولانا کہف الوریٰ مصباحی، مولانا شاہد مصباحی، مولانا قطب الدین مصباحی، مولانا اشرف رضا مصباحی، محمد عارف حسین مصباحی بہرائچی، ماسٹر فیاض احمد عزیزی اور کثیر تعداد میں علما و دانشوران نے شرکت کی۔

از: **محمد عارف حسین مصباحی**، شعبۂ تقابلِ ادیان، جامعہ اشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ میں شہید اعظم کانفرنس

شہدائے کربلا کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جامعہ اشرفیہ میں طلبہ کی تنظیم "بزم مسعودی" کے زیر اہتمام "شہید اعظم کانفرنس" شیخ الجامعہ علامہ محمد احمد مصباحی کی صدارت میں منعقد ہوئی اور نظامت محمد رضوان مراد آبادی نے کی، جس میں کربلا کا تاریخی پس منظر، امام حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کے مابین اختلافات کے وجوہات۔ شہدائے کربلا کا پیغام اور ماہ محرم الحرام میں مسلمانوں کے درمیان پھیلی ہوئی بری رسموں کے اسباب اور تدارک پر علمائے کرام نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

مفتی محمد نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ نواسۂ رسول امام حسین رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ بلند ترین مقام حاصل تھا جہاں پہنچ کر بندہ اپنے آپ کو رب کی رضا کے حوالے کر کے خوش نودی مولا میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزیدی لشکر کے مقابل اپنے جان و مال کی سلامتی کی دعا کرنے کے بجائے اس صبر آزما امتحان میں ثابت قدم رہنے کی دعا کی۔

انھوں نے مزید کہا کہ آج مسلمان اہل بیت کی محبت کے نام پر بعض غیر شرعی افعال کا ارتکاب کر کے خدا اور رسول کو ناراض کرتے ہیں جب کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اللہ و رسول کی خوش نودی کے لیے میدان کربلا میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو غلط رسم و رواج سے احتراز کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

مبلغ اسلام مولانا عبد المبین نعمانی مصباحی نے اپنے بیان میں کہا کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظالم و فاسق یزید پلید کی ناجائز حکومت کے خلاف حق کی صدا بلند کر کے ہمیں یہ پیغام دیا تھا کہ حق بات کہنے میں ظالم کے ظلم کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے اور کربلا کے میدان میں سجدے میں سر کٹا کر محبت حسین کا دم بھرنے والوں کو یہ ذہن دیا کہ نماز اتنی اہم عبادت ہے کہ اس کی خاطر موت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

تنظیم ابنائے اشرفیہ کے جنرل سکریٹری مولانا مبارک حسین مصباحی نے اپنے خصوصی خطاب میں فرمایا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اسلام کے عظیم محافظ، محبت رسول کے آئینہ دار اور صبر و استقامت کے کوہ ہمالہ تھے۔ آپ نے دین اسلام کی حمایت و سر بلندی کی خاطر یزیدی فوجوں کے مقابل پورے خاندان سمیت خود کو راہ مولا میں قربان کر کے شجرۂ اسلام کی ایسی آبیاری فرمائی جسے رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج کچھ خارجی ذہنیت کے حامل افراد امام حسین کے حق کی سربلندی کے لیے یزید کے خلاف جنگ کرنے کو ناحق قرار دے کر تاریخ کا خون کرتے نہیں تھکتے۔ حالاں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ یزید پلید ایسا ظالم و جابر ملعون شخص تھا کہ صحابۂ کرام اس کے فتنہ و فساد سے پناہ مانگتے تھے۔

پروگرام کے آخر میں مفتی محمد نظام الدین کے ہاتھوں روز نامہ راشٹریہ سہارا اردو کے نامہ نگار حافظ غلام رسول رضوی کو اعزازی تحفہ پیش کیا گیا۔

محمد صائم رضا بہرائچی، محمد تحسین رضا مبارک پوری، محمد سمیر مالیگاؤں اور محمد جنید رام پوری نے نعت و مناقب پیش کیے۔

پروگرام کا آغاز محمد عابد رضا بہرائچی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جب کہ اختتام مولانا عبد المبین نعمانی کی رقت انگیز دعا پر ہوا اور بزم مسعودی کے صدر مولانا محمد عارف حسین مصباحی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

از: بزم مسعودی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

☆☆☆

عالمی خبریں

ساؤتھ افریقہ میں جلسۂ دستار بندی

۷/ ۸/ نومبر ۲۰۰۹ء کو جامعہ امام احمد رضا احسن البرکات نیو کاسل ساؤتھ افریقہ کا پہلا دو روزہ جلسۂ دستار بندی بشکل میلاد النبی ﷺ، عرس اعلیٰ حضرت، عرس حافظ ملت و دیگر اولیا و صالحین علیہم الرحمۃ والرضوان، گل گلزار برکاتیت ڈاکٹر امین میاں برکاتی دامت برکاتہ کی عنایتوں اور دعاؤں کی چھاؤں میں اپنی روایتی شان و اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا۔ نیو کاسل جیسی شور اور سخت زمین پر جامعہ امام احمد رضا احسن البرکات کا قیام و اہتمام انھیں صوفی بزرگوں کی دعاؤں کی برکات اور روحانی تصرفات سے ممکن ہوا۔

پروگرام کے مطابق پہلا اجلاس حضرت مولانا فتح احمد بستوی مصباحی بانی دار العلوم حافظ ملت ڈربن کی صدارت میں ۷/ نومبر کو بعد نماز عشا قاری محمد مزمل خطیب و امام سینٹرل صوفی مسجد لیڈی اسمتھ کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ مختلف مقامی و بیرونی علما و شعرا نے اپنے اپنے انداز میں گلہائے نعت و منقبت پیش فرمائے اور پھر خصوصی مہمان، مولانا موسیٰ رضا قادری خطیب امام جامع مسجد لوڈیم پریٹوریا نے نعت رسول مقبول ﷺ پیش فرمائی اور پورا مجمع درود و تکبیر کے فیضان و برکات سے سرشار و نور بار ہو گیا۔ اخیر میں حضرت علامہ شاہد رضا نعیمی ورلڈ اسلامک مشن لندن نے روح اور روحانیت، اس کی اہمیت و معنویت، تقویت و غذائیت اور اس کی نگہ داشت و پرداخت پر نہایت پر مغز خطاب فرمایا۔ صلاۃ و سلام اور آپ ہی کی دعاؤں کے ساتھ تقریباً ۱۲/ بج کر ۴۰/ منٹ پر بڑی کامیابی کے ساتھ یہ سیشن اختتام پذیر ہوا۔

دوسرے دن ۱۰/ بج کر ۳۰/ منٹ صبح کو حضرت مولانا شاہ محمد رضوی کی صدارت میں جلسے کا آغاز حافظ نبیل یوسف سلمہ کی تلاوت قرآن حکیم سے ہوا۔ ایک بار پھر سنت حسان رضی اللہ عنہ کا سنہرا سلسلہ شروع ہوا۔ جامعہ کے طلبہ نے تلاوت قرآن کریم اور عربی انگلش اور زولو زبانوں میں خطبات پر مشتمل ایک نہایت دل نشین پروگرام پیش کیا اور سامعین کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ بعدہ ناظم جلسہ نے انگلش میں خطاب کیا، یہ ایک ایسا فکر انگیز اور درد مند انگلش خطاب تھا جس سے عوام تو عوام اسٹیج پر موجود علمائے کرام کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ آپ نے دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے جامعہ کی تعمیر و ترقی پر عوام اہل سنت کو مبارک باد پیش کی اور انھیں یقین دلاتے ہوئے فرمایا، جس طرح آپ نے اپنا قیمتی سرمایہ قربان کر کے نیو کاسل میں اس عظیم علمی کاسل کی بنیاد رکھی ہے، اسی طرح آج ہم غریب علما، فرزندان اشرفیہ، پروردگان بارگاہ حافظ ملت اور ہم اعلیٰ حضرت کے مصباحی غلاموں نے عہد کر لیا ہے کہ ہم اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

آپ کے بعد مہمان خصوصی علامہ شاہد رضا نعیمی نے جامعہ اور اس کے اساتذہ اور اس کے معاونین کی محنت اور خدمات کو سراہتے ہوئے لوگوں کو مثبت فکر و نظر اور تعمیری کردار و عمل کی نصیحت فرمائی۔ مرکزی خطاب کے بعد جامعہ کے پہلے فارغ التحصیل مولانا محمد حنفی کو دستار عالمیت سے سرفراز کیا گیا۔ اخیر میں بانی جامعہ نے علما و عوام کی بارگاہ میں کلمات تشکر نذر کیے۔ مفتی اکبر ہزاروی بانی دار العلوم پریٹوریا نے حضرت بانی جامعہ کو ان کی اس عظیم دینی خدمت پر ہدیۂ تبریک بشکل قرآن مقدس پیش کیا اور علما و مشائخ کے مقدس ہاتھوں آپ کی دستار بندی کی گئی۔ اس طرح یہ دوسرا اور آخری اجلاس بھی کامیابی کے ساتھ صدر اجلاس علامہ شاہ محمد رضوی کی دعاؤں کے ساتھ ختم ہوا۔ حضرت مولانا شمیم رضوی نے دونوں اجلاس کی نظامت فرمائی۔ مہمانوں کے علاوہ دونوں محافل کو مذکورہ ذیل علمائے کرام نے زینت بخشی: مولانا فیض احمد قادری، مولانا سید ارشد اقبال مصباحی، مولانا قاسم عمر مصباحی، مولانا یونس رضا مصباحی، مولانا قیصر مصباحی، مولانا قاری نظام الدین، مولانا سراج احمد مصباحی، مولانا قاری مبین احمد اشرفی، مولانا امیر علی وغیرہم۔

رپورٹ:- حبیب الرحمٰن نظامی مصباحی

استاذ جامعہ امام احمد رضا، نیو کاسل، ساؤتھ افریقہ

خیر و خبر

آل انڈیا علما و مشائخ بورڈ کے چند اہم مطالبات

۳؍ جنوری مرآداباد میدان کمپنی باغ۔ ہم ہر طرح کی دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں نہ وہابیوں کی امامت قبول ہے نہ ان کی قیادت منظور ہے، اس موقع پر پُر زور لفظوں میں حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا کہ سنی وقف بورڈ حج کمیٹی اور دیگر تمام اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں سنی مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے صحیح نمائندگی دی جائے۔ اور حضرت خواجہ غریب نواز کے عرس کے موقع پر ۶؍ رجب کو عام تعطیل کا اعلان کیا جائے اور ۱۲؍ ربیع الاول شہر لکھنؤ میں جلوسِ محمدی نکالنے کی اجازت دی جائے۔ ان خیالات کا اظہار سنی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم آل انڈیا علما و مشائخ بورڈ کے زیر اہتمام منعقدہ سنی کانفرنس میں ملک کے مختلف صوبوں سے شرکت کرنے والے ہزاروں سجادگان مشائخ، علما اور ائمہ مساجد نے کیا۔ کانفرنس کی سرپرستی علامہ الحاج سبحان رضا خاں سبحانی میاں سجادہ خانقاہ رضویہ بریلی شریف نے کی۔ سنی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا سید محمود اشرف صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ بھارت کی مسلم آبادی میں ۸۰٪ سنی مسلمان ہیں۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ بڑی آبادی اپنے حقوق سے محروم ہے۔ اور مسلمانوں کے ہر شعبہ کی قیادت ان ۱۳٪ وہابیوں کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی ہے۔ جو مسلم سماج کا **ایک** چھوٹا سا حصہ ہے۔

اس موقع پر آل انڈیا علما و مشائخ بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمد اشرف کچھوچھوی نے لاکھوں سنی مسلمانوں کے سامنے متعلقہ تجاویز پیش کیں جس کی ہزاروں علما، سجادہ نشیں اور مساجد کے اماموں نے اپنے ہاتھ اٹھا کر تائید کی انہوں نے سچر کمیٹی اور رنگ ناتھ مشرا کمیشن اور ان جیسی دوسری سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے سفارشات کے نفاذ کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ سچر کمیٹی اور مشرا کمیشن کو مرکزی اور ریاستی حکومت سے پوری ایمانداری سے عملی جامہ پہنائے اور مطالبہ کیا کہ سنی سینٹرل وقف بورڈ سنی مسلمانوں کے حوالہ کیا جائے۔ اور ہندوستان کی ہر حج ہاؤس کی مسجدوں میں سنی عقیدہ کے امام کی تقرری کی جائے۔ مولانا محمد ہاشم کانپوری، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید نے کہا کہ فرقہ پرستی اور دہشت گردی دونوں قابل مذمت ہیں اس لیے کہ دہشت گردی فرقہ پرستی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے واضح رہے کہ اسلام امن و شانتی کا مذہب ہے کوئی بھی دہشت گرد اسلام کا وفادار ہو ہی نہیں سکتا۔

مولانا توقیر رضا خاں صدر اتحاد ملت نے کہا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید اور آل انڈیا کو آرڈی نیشن کمیٹی کے ذریعہ دی گئی ترمیمات اور طلب کردہ وضاحت کے ساتھ مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔ مفتی شہر مرادآباد مفتی محمد ایوب خاں رضوی نے قرآن کی آیتوں کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح بد عقیدوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ہیں اسی طرح وہابیوں کی قیادت کو ہم مسترد کر دیں۔

اجمیر شریف کے گدی نشیں مولانا سید شاہد چشتی نے کہا کہ یہ ملک صوفی سنتوں کا ملک ہے اور خواجہ غریب نواز کا آستانہ ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی کے آستھا کا مرکز ہے لہٰذا ایسے بزرگ صوفی کے عرس ۶؍ رجب پر تعطیل عام کیا جائے۔

ان کے علاوہ حضرت محمد ثقلین میاں قادری بریلی شریف، مفتی معین الدین اشرفی بہار، مفتی آفاق صاحب قنوج، ڈاکٹر شعیب صاحب اٹاوہ، مولانا نظام الدین ممبئی، مولانا کفیل احمد کیفی رانچی، مفتی اختصاص الدین سنبھل، مولانا یامین احمد نعیمی مہتمم جامعہ نعیمیہ، فرحت میاں جمالی رامپور، مولانا سید اسلم وامقی بریلی، شاہ عمار احمد نیر میاں صاحب ردولی مفتی سلیمان احمد نعیمی برکاتی سید نظام الدین چشتی بہرائچ، علامہ ہاشم مرادآباد، محمد مختار عالم دہلی خاص طور سے موجود تھے۔

کانفرنس کا آغاز قاری گلزار نے قرآن پاک کی ان آیتوں سے کیا جس میں دہشت گردی کو ناپسند کیا گیا ہے اور نظامت مولانا رئیس اشرف مرادآبادی نے انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔

میڈیا انچارج: سید بابر اشرف

کیمری، رام پور میں نوری پبلک لائبریری کا قیام

قصبہ کیمری میں نوری پبلک لائبریری کے قیام کے تعلق سے ایک اہم میٹنگ کا انعقاد ہوا۔ کیمری و قرب و جوار کے حفاظ و علمائے کرام اور دیگر حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔ میٹنگ کا

آغاز تلاوتِ کلام اللہ سے ہوا۔ بعدہ مولانا جلال الدین مصباحی نے کتابوں اور لائبریریوں کی اہمیت و افادیت پر مفصل روشنی ڈالی۔ میٹنگ کے اختتام پر مولانا صغیر اختر مصباحی نے جامع خطاب فرمایا۔

اس لائبریری کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب راقم الحروف کو علی گڑھ اور بنگلور یونیورسٹی میں زیر تعلیم کیمری کے بعض احباب نے خبر دی کہ وہاں سنی طلبہ کی تعداد بہت کم اور دیوبندی و وہابی طلبہ کی تعداد زیادہ ہے۔ کیوں کہ دیوبندی علما تبلیغ کے نام پر ہر ہفتہ یہاں کا دورہ کرتے ہیں اور طلبہ کو نماز، روزہ وغیرہ مسائل کا درس دیتے ہیں اور وافر مقدار میں پمفلٹ اور کتابچے تقسیم کرتے ہیں۔ اگر سنی علما نے یونیورسٹیز کا رخ نہ کیا اور اپنے مسلک کی تائید میں پمفلٹ اور کتابچے تقسیم نہ کیے تو وہ دن دور نہیں کہ تمام طلبہ وہابیہ و دیابنہ کے ہم عقیدہ ہو جائیں گے۔ ان طلبہ نے مجھ سے اصرار کیا کہ کیمری اہل سنت و جماعت کی بستی ہے۔ اس میں ایک دینی لائبریری قائم کی جائے اور مختلف زبانوں میں کتابیں فراہم کی جائیں۔ راقم الحروم نے ان طلبہ کے جائز مقاصد پر لبیک کہتے ہوئے نوری پبلک لائبریری کو دار المطالعہ کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قائم کیا۔ حاضرین مجلس کے باہمی مشوروں سے مولانا محمد اسحاق مصباحی کو لائبریری کی مجلس شوری کا صدر، حافظ صغیر احمد کو نائب صدر، مولانا جلال الدین مصباحی کو سکریٹری اور حاجی شفیع حسن کو مجلس منتظمہ کا خازن منتخب کیا گیا۔

از: **محمد سلیط رضوی**، نگراں نوری پبلک لائبریری، کیمری، رام پور

مبینِ ملت کا عرسِ چہلم

شیخ طریقت مولانا حافظ و قاری الحاج شاہ مبین الہدیٰ نوری مصباحی علیہ الرحمہ کا اچانک ۲۶/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی یاد میں ۴/ دسمبر کو تقریب عرس منعقد کی گئی جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے علما، مشائخ اور مفکرین ملت شریک ہوئے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے سربراہِ اعلیٰ علامہ عبد الحفیظ عزیزی، دار العلوم غریب نواز الہ آباد کے مولانا محمد مجاہد حسین مصباحی، مولانا سید محب الحق آسوی بلرام پور، خانقاہ جہانگیریہ آسویہ کے سجادہ نشیں صوفی محمد راشد رضا آسوی، مولانا محمد عمر نورانی گیا، مولانا بشیر القادری، مفتی محمد یونس رضا مونس اویسی کے اسما خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں علما اور مریدین و متوسلین نے شرکت کی۔ مولانا مبین الہدیٰ مشہور و معروف عالم تھے۔ موصوف گیا میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور مختلف جہات سے اسلامیات پر کام کیا اور کتابیں بھی لکھیں۔ نیز اصلاحِ معاشرہ، قومی، ملی، اور سماجی امور پر اچھا کام کیا، مدرسہ گلشن حسین اور خانقاہ **تعمیر** کی۔ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے تلامذہ اور خلفا ہیں۔ **تجلیاتِ** **کنز الایمان**، امام احمد رضا کون؟ نماز کیوں اور کیسے؟ فاتحہ کیوں اور کیسے؟ وغیرہا کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

چار صاحب زادے جناب محمد رضوان الہدیٰ علیگ، مولانا فیضان الہدیٰ سجادہ نشیں مولانا برہان الہدیٰ مصباحی، جناب ریحان الہدیٰ، ایک صاحب زادی اور اہلیہ محترمہ پس ماندگان میں ہیں۔ اس جلسہ میں علما کے مبارک ہاتھوں مولانا برہان الہدیٰ مصباحی کی رسم سجادگی و جانشینی عمل میں آئی۔ ہندوستان بھر سے زائرین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

از: **مبین ملت اکیڈمی**، نوری مرکز، جواہر نگر، جمشید پور

مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن کا یومِ تاسیس

۱۸/ دسمبر ۲۰۰۹ء کو انجمن فیضان نوری کے زیر اہتمام مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، لکھنؤ کے ۱۹/ ویں جشن یوم تاسیس اور مدرسہ کی نو تعمیر، حنفیہ لائبریری کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے استاذ (حال مقیم امریکہ) مولانا مسعود احمد برکاتی نے کہا کہ لائبریری اہل علم کا اسلحہ خانہ ہے جس طرح میدانِ جنگ میں فوجیں اسلحہ کے بغیر فتح حاصل نہیں کر سکتیں، اسی طرح اہل علم لائبریری کے بغیر اپنے مطلوبہ اہداف کو حاصل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ کتابیں اہل علم کا ہتھیار ہیں، ان کے بغیر اصلاح و انقلاب کا کوئی بھی کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے سابق چیرمین سید ندیم اشرف جائسی نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ مدارس دینی تعلیم کے مرکز ہیں۔ قاری ذاکر علی قادری نے لائبریری کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی جب کہ مفتی محمد حبیب اللہ نعیمی بلرامپوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کتب خانوں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ لائبریری کا افتتاح سید ندیم اشرف جائسی نے کیا۔ بعد نمازِ عشا جلسہ ہوا جس کی سرپرستی قاری محمد احمد بقائی نے کی۔ آغاز قاری محمد احمد کی تلاوتِ

قرآن پاک سے ہوا۔ محشر بریلوی، اشہر بہرائچی اور اجمیر علی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا، نظامت قاری جمیل احمد نے کی۔ قاری رئیس احمد، محمد رفیق وارثی، مولانا محمد عالم مصباحی اور مولانا ریاض بستوی نے بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ جلسے میں کثیر تعداد میں مدارس کے اساتذہ، طلبہ اورمعززینِ شہر نے شرکت کی۔ آخر میں ایک قرارداد پاس کر کے دنیا کے ۵۰۰/ باثر مسلمانوں میں البرکات کے بانی سید امین میاں مارہروی کو ۴۴/واں مقام ملنے پر انھیں مبارک باد پیش کی گئی۔ اختتام صلاۃ وسلام اورمفتی نظام الدین برکاتی کی دعا پر ہوا۔

از: **محمد عرفان قادری**، مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، لکھنؤ

مجاہدِ ملت کنونشن وکانفرنس

عالمِ اسلام کی عظیم روحانی اور علمی شخصیت مجاہدِ ملت علامہ حبیب الرحمٰن رضوی علیہ الرحمہ کی آفاقی خدمات کے حوالے سے یکم نومبر ۲۰۰۹ء کو مٹیا برج کلکتہ میں امام احمد رضا سوسائٹی کولکاتا کی جانب سے "مجاہدِ ملت کنونشن" منعقد ہوا جس کی سرپرستی سید غلام محمد حبیبی (جانشینِ مجاہدِ ملت) نے کی۔ یہ کنونشن دو سیشنوں پر مشتمل تھا۔ پہلے سیشن میں سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے فرمائی۔ اس میں پروفیسر شاہد اختر محسن کالج ہگلی، پروفیسر جمیل اشرفی، مولانا آزاد کالج کولکاتا، پروفیسر ڈاکٹر دبیر احمد مولانا آزاد کالج فہیم انور کلکتہ دوردرشن، مولانا حنیف قادری اڑیسہ، مولانا محمد شاہد القادری، کولکاتا، مولانا مجاہد حسین حبیبی کولکاتا نے مقالات پیش کیے۔ اس سیمینار میں بحیثیت مہمانِ خصوصی الحاج محمد سعید نوری چیرمین رضا اکیڈمی ممبئی نے شرکت کی۔

دوسرے سیشن میں کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت مولانا محمد قاسم علوی نے فرمائی۔ الحاج محمد سعید نوری کو "امام احمد رضا نیشنل ایوارڈ" مولانا ابوالکلام حسن القادری کو "مفتیِ اعظم ہند ایوارڈ" اور تکریمی خطاب "ممتاز الاساتذہ" پروفیسر شاہد اختر حبیبی کو "تاج الشریعہ ادبی ایوارڈ" اور مجاہدِ ملت پرائمری اسکول، ہگلی کو "مجاہدِ ملت تعلیمی ایوارڈ" دیا گیا۔ اس موقع پر امام احمد رضا سوسائٹی کا علمی اور فکری ترجمان "ماہ نامہ دبستانِ رضا" اور "سوانحِ مجاہدِ ملت" (مرتبہ مولانا محمد شاہد القادری) کا رسم اجرا ہوا۔ از: **حافظ غضنفر محمود رضوی**، کلکتہ

☆☆☆

(ص: ۴۳/ کا بقیہ) ـــسامنے چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹ لینا۔ یقیناً یہ منظر انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور نہ جانے کتنے منچلے اپنی عاقبت دیکھ کر باز آجاتے ہیں۔

یہی اسلام کا وہ طرۂ امتیاز ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ مذہبِ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر کے اس کے دامن کرم سے وابستہ ہو جائیں۔

تہمت:- ہر مذہب اپنے ماننے والوں کو یہی پیغام دیتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں حسنِ ظن رکھو۔ بغیر کسی گناہ میں ملوث دیکھے اس پر تہمت نہ لگاؤ، اس کے کردار پر انگلی نہ اٹھاؤ اور اس کی ذات پر حملہ نہ کرو۔ اگر ایسا کیا تو اسے سزا کا مستحق سمجھا جائے گا۔ مگر یہ جرم کے روکنے کے طریقوں میں ایک طریقے پر عمل تھا۔ لہٰذا بے قصور انسانوں پر تہمت لگانے کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ مگر اسلام نے ہمیں جو نظام دیا ہے اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو یقیناً ان سب کا خاتمہ ہو جائے۔ اسلام نے پہلے اس کے اسباب ومحرکات پر غور کیا تو پتہ چلا کہ انسان کے کردار اور اس کی ذات پر شک اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ وہ ایسی جگہ موجود ہو جہاں لچے اور خبیث لوگ جاتے ہیں اور دوسروں کو شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ بھی ان گناہوں میں ملوث تو نہیں۔ قمار خانہ اور شراب خانہ میں شریف لوگ نہیں جاتے، لہٰذا سب سے پہلے اسلام نے یہ حکم صادر فرمایا: "إتقوا مواضع التهم" "تہمت کی جگہوں سے بچو تاکہ تمہارے کیریکٹر پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع تک نہ ملے۔ اب دوسرے پہلو پر عمل ہو گا۔ یعنی اس کے باوجود اگر کوئی صرف دشمنی نکالنے کے لیے سماج میں تمہارے وقار کو مجروح کرنے کے لیے تہمت لگائے تو پھر اسلام تہمت لگانے والے کے لیے کڑی سزا منتخب کرتا ہے جسے دیکھ کر بغیر کسی شہادت کے کسی پر اتہام بازی کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہی وہ خوبی ہے جس کے سبب خدا نے اسلام کو پسندیدہ دین کا تمغہ عنایت فرمایا۔

ہماری اس گفتگو سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مذہبِ اسلام اور دیگر مذاہب میں کیا فرق ہے اور ساری دنیا میں صحیح امن وامان کا ضامن کون سا مذہب ہے۔ یہ تو چند مثالیں تھیں۔ اگر کوئی منصف مزاج اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کرے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ اگر اسے دنیا سے جرائم کا خاتمہ کرنا ہو تو اسلامی قوانین کا نفاذ ہی اس کا واحد راستہ ہے۔ ☆☆☆☆☆